



ماہنامہ محدث لاہور

شمار نمبر: 32۔۔۔۔۔ جلد نمبر 3۔۔۔۔۔ شماره نمبر 12۔۔۔۔۔ دسمبر 1973ء۔۔۔۔۔ ذی الحجہ 1393ھ

ماہنامہ 'محدث' لاہور کا اجمالی تعارف

مدیر اعلیٰ: حافظ عبدالرحمن مدنی مدیر: ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

ماہنامہ 'محدث' لاہور، ہندوستان سے نکلنے والے ایک رسالے کی ارتقائی شکل ہے۔ جامعہ رحمانیہ دہلی سے نکلنے والے رسالے۔ جس کا نام محدث

تھا کو پروان چڑھاتے ہوئے تقسیم ہند کے بعد دوبارہ ماہنامہ 'محدث' لاہور کے نام سے پاکستان میں معروف عالم دین و دانشور

حافظ عبدالرحمن مدنی نے اس کا اجراء کیا۔ یہ تحقیقی رسالہ 1970ء سے اب تک کامیابی و کامرانی سے شائع ہو رہا ہے، واللہ الحمد!

محدث کی علمی پہچان کے حوالے سے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ ہر صاحب علم و فضل کی ضرورت بن چکا ہے کیونکہ اس کے مضامین جدید فکر کے حامل اور
محدثانہ افکار کیلئے شمشیر بے نیام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

گھر بیٹھے 'محدث' وصول کیجئے!

قارئین کرام! گھر بیٹھے محدث حاصل کرنے کیلئے درج ذیل طریقہ کار اختیار کریں!

فی شمارہ: 20 روپے زیر سالانہ: 200 روپے بیرون ملک: 20 ڈالر

بذریعہ منی آرڈر / بینک ڈرافٹ 200 روپے بھیج کر سال بھر گھر بیٹھے محدث وصول کریں اور علمی و تحقیقی مضامین سے استفادہ کریں۔

ایڈریس: ماہنامہ محدث، 99 جے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔ فون نمبر: 35866476 / 3586639 - 042

موبائل: 0305 - 4600861

انٹرنیٹ پر محدث پڑھنے اور ڈاؤن لوڈ کرنے کیلئے درج ذیل ویب سائٹ دیکھئے!

www.mohaddis.com www.kitabosunnat.com

مزید تفصیلات کیلئے: webmaster@kitabosunnat.com



اجرائے محدث کے مقاصد

عناد اور تعصب قوم کیلئے زہرِ بلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں!

لیکن تعصبات سے بالاترہ کرافہام و تفہیم امت کیلئے رحمت کا باعث ہے۔

علومِ جدیدہ سے ناواقفیت اور انکار، انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں!

لیکن قدیم علومِ اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دُقیانوسِ بتانا امت کی تباہی کا سبب ہے۔

غیر مذہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اقدار کے منافی ہے!

لیکن دینِ اسلام پر غیر مذہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام نہ دینا حمیتِ دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

تبلیغِ دین اور اشاعتِ اسلام میں حکمتِ عملی کو نظر انداز کر دینا مصالحِ دینیہ کے خلاف ہے!

لیکن حلال اور حرام کے امتیاز میں رواداری برتنا اور قوانین و مسائلِ اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی روح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

آئین و سیاست سے بیگانہ ہر کر عبادت کیلئے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے!

لیکن جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔

جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اوصاف میں داخل ہے!

لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو

ماہنامہ مہات لاہور

کا مطالعہ فرمائیے، آپ اس کو ان جملہ صفات و محاسن سے مزین پائیں گے، ان شاء اللہ! کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

فہرست

- 2 دورِ ابتلاء اور اسوۂ ابراہیمی
- 6 التفسیر والتعبیر
- 17 سزائے مرتد پر چند مغالطے اور ان کا دفعیہ
- 25 تعلیم و تبلیغ، مسلم اقلیتوں، تارکینِ وطن اور اسلامی قانون کی تدوین کے مسائل پر اہم مباحث

فکر و نظر

دور ابتلاء اور اسوہ ابراہیمی

آج کل پورا عالم اسلام، خاص کر ”براہیمی سرزمین“ ابتلاء اور محن کے ایک ایسے دور سے گزر رہی ہے جو حوصلہ شکن بھی ہے اور غضب الہی کا غماز بھی۔ یوں دکھائی دیتا ہے کہ پوری غیر مسلم دنیا، چاروں طرف سے ’مسلم دنیا‘ کے گرد گھیر اڑانے میں مصروف ہے تاکہ کوئی بھی اس کی مدد کو نہ پہنچ سکے، اپنے نہ پرے۔ اور اندر ہی اندر اس کا دم گھٹ کر رہ جائے۔

یہ نرغہ اور یہ ابتلاء آج سے تقریباً پونے چار ہزار سال پہلے بھی شروع ہوا تھا۔ ہم تو آج تقریباً ستر کروڑ ہیں۔ اس وقت صرف ایک بندہ خلیل تھا۔ ہمیں آج اپنے تو کم از کم کندھا دینے کو آہی جاتے ہیں اس وقت جو اپنے تھے وہ سب سے بڑے دشمن بھی تھے۔ لیکن ہمیں شکستوں پر شکستیں آرہی ہیں اور وہ ایک فاتح کی حیثیت سے سارے سنسار پر بھاری ہو رہے تھے، ہمیں تو یں محسوس ہوتا ہے جیسے دنیا کی ہر چیز، ابر و باد ہوں یا شجر و حجر، انسان ہوں یا حیوان، پانی ہو یا آگ، ”سبھی ہمیں کھانے اور مٹانے کو دوڑتے ہیں۔ لیکن ساری کائنات ارضی میں رب کے ایک خلیل جلیل کی مدد کو پہنچنے کے لئے جاندار بھی بے چین ہیں اور بے جان بھی۔ پرندے ہوں یا فرشتے، آگ ہو یا ایندھن، سبھی پہرے دار بن کر آ حاضر ہوئے ہیں۔ ہم آگ و خون میں لت پت ہو رہے ہیں مگر وہاں ’نار گلزار‘ ہو رہی.... مقام غور ہے کہ آخر وہ ایسی کیا بات اور کیا اقتدار تھیں جن کی وجہ سے ہم دونوں ایک دوسرے سے متضاد انتہاؤں پر چلے گئے ہیں۔ وہ آگ میں پڑ کر لالہ زار اور ہم لالہ زاروں میں رہ کر ذلیل و خوار.... ہم میں سے کسی ایک پر بن جائے تو عرب و عجم کا ہر فرد مسلم تڑپ اٹھتا ہے اور مدد کو دوڑتا ہے مگر وہاں حالت یہ تھی کہ:... باپ مخالف، برادری مخالف، شہر مخالف، ملک مخالف، عراق اور مصر جیسی ’نمرودی اور فرعونی سپر طاقتیں مخالف، حضرت مخالف، سفر مخالف، گھر مخالف، در مخالف لیکن نار ہے کہ آنکھیں بچھا رہی ہے۔ دشمن ہے تو تحائف پیش کرنے پر مجبور ہے۔ آخر قصہ کیا ہے؟ بات بھائی صاف ہے: ان کا دل نہ مے خانہ تھا اور نہ بت کدہ بلکہ ان کا دل بے داغ تھا: (قَلْبٍ سَلِيمٍ ۸۳/۳۷) جو دوئی کے ہر تصور سے پاک تھا۔ (حَنِيفًا ۷۹/۶)

خدا کے بارے میں غیر متزلزل یقین رکھتے تھے (وَمِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۷۶/۷۵) ان کے سارے سفر حیات کی منزل ذات الہ تھی۔ (إِنِّي مَهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي ۲۹/۲۶) جو رقصور کے لئے نہیں بلکہ رہنمائی کے حصول کے لئے (إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيِّئِينَ ۹۹/۳۷) نہ آل و اولاد کے تن و توش کے لئے بلکہ وہ اس کی راہ میں ان کو قربان کرتے تھے۔ (ذَبْحٍ عَظِيمٍ) اقتدار کے نشہ میں دھت اور دولت و سیاست کے دیوتاؤں کی یک وقتی اور جھوٹی کروفر سے تعبیر کیا کرتے تھے، اس لئے سب سے بڑے زوال پذیر ستاروں سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے تھے۔ اور نہ مظاہر قدرت سے کبھی غلط متاثر ہوئے (لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ ۷۶/۷۶) بلکہ حق کے معاملہ میں حد درجہ غیور تھے اس لئے باطل جب کبھی سامنے آیا تو پوری قوت کے ساتھ اپنی ضرب کاری سے اس کو پاش پاش کر ڈالا:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

(فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبُ الْيَمِينِ ۹۳/۳)

اور جس بھی میدان میں اسے ڈالا گیا، پاس رہے، پاؤں میں لغزش آئی نہ قلب و نگاہ کے طور بدلے:

وَإِذْ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ (۱۲۴/۲)

اس لئے بالآخر آواز آئی، جہاں دنیا کی امامت اور قیادت یہ لو: (إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۱۲۴/۲)

باقی رہے دوسرے؛ فرمایا: جو بے وفاییں ان کے لئے کوئی وعدہ نہیں:

لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ (۱۲۴/۲)

اگر ہم یہ کہیں کہ آج یہ ساری رسوائی خدا سے ہماری اس بے وفائی کا نتیجہ ہے تو اس میں قطعاً مبالغہ نہ ہو گا وہ اپنے آقا سے وفا کر کے خلیل ہوئے

اور ہم اس سے بے وفائی کر کے ذلیل ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بت شکن اٹھ گئے باقی جو رہے بت گر ہیں

تھا براہیم پدر، اور پسر آذر ہیں

اقبال کہتا ہے کہ یہ رونے دھونے کیسے؟ اپنے کو دیکھو کہ تم کیا ہو؟

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلمان نابود ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود

وضع میں تم ہو نصار لے تو تمدن میں ہنود یہ مسلمان ہیں جنہیں دیکھ کے شرما میں یہود

یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو

تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

بہر حال ہم سے جو معاملہ کیا جا رہا ہے، وہ ایک با وفا مسلمان سے نہیں کیا جا رہا بلکہ بے وفا مسلمان سے ہو رہا ہے۔ اگر چاہتے ہو کہ پھر سے وہ اپنے

فیضان کو آپ کے لئے عام کرے تو پھر 'اسوہ براہیمی' آپ کے سامنے ہے۔ اگر آپ کے ہاتھوں اس کی تجدید ہو گئی تو پھر ہر نارنگزار ہو گی۔ ان شاء اللہ

اسلامی سربراہی کا نفرنس

پورا عالم اسلام، فوجی اہمیت کا علاقہ۔ مالی وسائل کے اعتبار سے سونے کی چڑیا اور روحانی لحاظ سے عظیم انبیاء، صحابہ، صلحاء اور اتقیا کا مسکن ہے۔ مگر

افسوس! مدتوں سے اب یہ صرف 'چڑیا' ہو کر رہ گیا ہے۔

فوجی اہمیت کا علاقہ ہونے کے باوجود مجاہدانہ اسلامی اسپرٹ، کیریٹر اور عشق سے تہی دامن اسے کھا گئی ہے۔ ملی انتشار، ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ کی

جداگانہ ریاستوں کی تخلیق، ملت فروش حکمرانوں کا غلبہ اسلامی مستقبل سے بے نیاز اور لیلائے اقتدار کے مجنوں کے تسلط اور غیر وفاقی ذہن کے افراد

کے غلبہ نے ہمیں اور ذلیل کیا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اس کا مداویہ ہے کہ:

اسلامی اقدار زندگی اور نبوی طرز ریاست کے احیاء کی مخلصانہ کوشش کی جائے اور عالم اسلام کی چھوٹی چھوٹی سبھی ریاستوں کو ایک ایسے 'وفاقی نظام' میں منسلک کیا جائے جس میں ان کے جداگانہ تشخص کے باوجود 'سیاسی حکمت عملی' ملی وحدت کے تابع ہو۔

جدید اسلحہ کے معاملے میں خود کفیل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے وسائل کو یکجا کیا جائے اور اسلحہ سازی کے لئے مختلف ریاستوں میں اسلحہ ساز فیکٹریاں قائم کی جائیں اور اپنے اپنے حصص اور ضرورت کے مطابق ممبر ملکوں میں ان کو تقسیم کیا جائے۔ لیکن موقع و محل کے لحاظ سے ایک دوسرے کے لئے حاصل کرنا آسان ہو۔ دفاع کے معاملہ میں یکسانیت پیدا کی جائے اور اس کو اتنے طاقت ور بلاک کی شکل دی جائے جسے عہدِ حاضر کی عظیم طاقتوں کے لئے نظر انداز کرنا آسان نہ ہو۔ اگر مسلم چاہیں تو یہ بات کچھ زیادہ دشوار بھی نہیں ہے۔

عالم اسلام کی اپنی وفاقی عدالت یا یو۔ این۔ او ہو جہاں ان کے باہمی جھگڑوں کا تصفیہ کیا جاسکے اور جس کی طرف ہمارے لئے رجوع کرنا آسان ہو۔ خارجہ پالیسی اپنے 'وفاقی ادارہ' کی معرفت متعین کی جائے جس کی عالم اسلام کی سب ریاستیں سختی سے پابندی کریں۔ اور اسی وفاقی ادارہ سے آزاد یا باغی ہو کر کوئی ریاست غیر ممالک سے روابط استوار کرنے کی مجاز نہ ہو۔ اور کوشش کی جائے کہ ہر سال اسی وفاقی ادارہ کا چیئرمین باری باری ممبر ملکوں سے منتخب کیا جائے۔

وفاقی نظام میں صرف 'قرآن و سنت' کے دستور کو بنیادی حیثیت حاصل ہو۔ اور ہر ممبر ملک کے لئے یہ ضروری ہو کہ وہ بتدریج اپنے ملک میں اس کو نافذ کرے اور اسلامی اقدار حیات کو فروغ دے تاکہ ایک ایسا اسلامی وفاقی معاشرہ وجود میں آجائے جو آئندہ چل کر ملتِ اسلامیہ کی 'ملی وحدت' کے لئے مضبوط اساس بن سکے اور مسلم کو اسلامی طرز حیات کی برکات اور رحمتوں کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ بھی نصیب ہو جائے۔

ایک اپنی عالمی خبر رساں ایجنسی کا بھی اہتمام ہونا چاہئے تاکہ اپنی خبریں غیروں کی دروغ آشنایان سے سننے کے بجائے اپنی کہانی اپنی زبانی معلوم کی جاسکے۔ غیروں نے ہمیشہ توڑ موڑ کر ہماری خبروں کو پیش کیا ہے جن کی وجہ سے ہم باہم ایک دوسرے سے بدگماں رہے ہیں اور ایک دوسرے کو سمجھنے کے بجائے دفع کرنے کے موڈ میں رہے ہیں۔

اسلامی سربراہی کا نفرنس ہی مندرجہ بالا مقاصد کے احیاء اور استحکام کے لئے ایک سازگار فضا مہیا کر سکتی ہے۔ بہر حال ہمارے نزدیک یہ سب جزئیات ہیں، بنیادی اساس وہ عظیم تر وفاق کا قیام جس میں یہ سارے مقاصد آسانی سے ہو سکتے ہیں۔

قرآنی نقطہ نظر سے ہم اس امر کے پابند ہیں کہ ہم اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں اور اپنی انفرادی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے ایک ایسے عظیم تر وفاق کی بنیاد لیں جس میں منسلک ہونے کے بعد کوئی ممبر ملک اپنے کو تنہا تصور نہ کرنے پائے اور نہ علیحدگی کا احساس اسے کسی احساس کمتری میں مبتلا کر سکے!

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا سِوَا الْوَحْدَةِ

یہ رسی وہ دھاگہ ہے جس میں موتیوں کی لڑی کی طرح ہمارا ہر فرد اور ہماری ہر جمعیت ایک سلیقہ کے ساتھ منسلک ہو رہے ہیں اور یہ ہمارے سب کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

لئے سرمایہ افتخار ہو اور سب کے گلے کا ہار بھی ہار ہو۔

ملیٰ حدت کو رسی، کہنے سے غرض ہی یہ ہے کہ اس میں منسلک ہونے کا سب تصور کر لیں۔ یا یہ ایک ٹیم کی طرح مجتمع ہو کر ایک ساتھ رسی کو تھام لیں اور تنازع البقاء کی اس رُسہ کشی، میں ساری دنیا سے بازی لے جائیں۔ دنیا کی امامت آپ کے ہاتھ میں ہو کیوں کہ آپ کی امامت کے بغیر دنیا کو دنیا استعمال تو کر سکتی ہے، اسے کچھ دے نہیں سکتی۔ دنیا سب سے مظلوم ہے۔ اس کے دامن میں دولت دیں ہے نہ دنیا۔ اس کو بچانا صرف ’مسلم‘ کے بس کا روگ ہے:

وان تولیت فان علیک اثم الاریسیین (بخاری بنام ہر قل)

ورنہ اپنی جواب دہی کے علاوہ پوری دنیا کا گناہ بھی آپ کے ذمہ ہو گا۔ اگر آپ نے دامن دیں تھام کر دنیا کو بھی تھام لیا تو اللہ آپ کو اس کا دگنا اجر دے گا۔

اسلم تسلم یوتک انہ اجرک مرتین (بخاری)

قسط (۵)

عزیز زبیدی واربرٹن۔

التفسیر والتعبیر

تفصیل:

گو ان سب کا حاصل ایک جیسا ہے، تاہم ان میں ایک گونہ تنوع بھی پایا جاتا ہے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ مختصر اُس کا بھی ذکر ہو جائے تو قلب و نگاہ پر مہر اور پردے والی بات بھی مزید واضح ہو جائے زیادہ یہ تفصیل حضرت امام ابن القیمؒ (ف ۷۵۱ھ) کی کتاب 'شفاء العلیل فی مسائل القضاء والقدر والحکمۃ والتعلیل' (ص ۹۲ تا ص ۱۰۷) سے ماخوذ ہے اور کچھ 'مفرداتِ راغب' سے۔ ان کے علاوہ اگر کوئی اور کتاب ہوگی تو اس کا حوالہ ضرور دیا جائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ، ہاں یہ سبھی کچھ بطور حاصل اور تلخیص کے ہو گا۔ من وعن ترجمہ نہیں ہو گا۔ کیونکہ یہاں اس کی اتنی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن تشریحی اور توضیحی پہلو نمایاں ہو گا۔

1. ان میں سے بعض کا تعلق براہِ راست دل سے ہے جیسے ختم، طبع، قفل وغیرہ
2. بعض وہ ہیں، جو دل تک رسائی کا واسطہ اور ذریعہ ہیں جیسے صمم اور وقر۔
3. کچھ وہ ہیں جو اس سلسلے کے مقدمات کی طرف رجوع کرتے ہیں جیسے غمی اور غشاوہ۔
4. اور کچھ وہ ہیں جن کا تعلق دل کے ترجمان اور قاصد سے ہے۔ جیسے بکم لفظی۔
5. ہاں یہ یاد رہے، یہ سب حقائق ہیں مجاز اور استعارے نہیں ہیں کیونکہ بات موقع محل کی ہے، جس محل پر جو بات کہی گئی ہے، اس کی وہی حقیقت ہے۔ دراصل یہ نظریہ شیخین (ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ) کا خاص نظریہ ہے، کیونکہ وہ قرآن میں مجاز کے قائل نہیں ہیں۔

ختم اور طبع:

ڈھانپ لینا اور یوں چھا جانا کہ باہر سے کوئی شے اندر داخل نہ ہونے پائے 'ختم اور طبع' ہے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اگر یہ صفت فطرتِ ثانیہ بن جائے تو اسے 'طبع' کہتے ہیں۔ گویا کہ بہیمیت اور نفسانی خواہشات اور بعض مصالحِ عاجلہ یوں چھا جاتے ہیں کہ ان کو چاک کر کے حق کا ان کے قلب میں داخل ہونا ناممکن ہو جاتا ہے۔

آئینہ:

اس سے وہ ترکش اور غلاف مراد ہیں جن کی لپیٹ میں دل آجاتے ہیں۔ یعنی دل ان اغراض کی تہ میں چلا جاتا ہے جن سے علیحدہ ہو کر اس کے لئے 'حق' کو سوچنا اور سمجھنا ممکن نہیں رہتا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

غطاء:

اس سے مراد 'سرپوش' ہے جیسے ڈھکنا وغیرہ۔ اس کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ آنکھوں پر 'کھوپے' (یاپٹی کہہ لیجئے) چڑھے ہیں۔ اس لئے وہ قدرت کی نشانیوں اور آثارِ توحید کے دیکھنے سے قاصر رہتا ہے۔
دوسرا یہ کہ ان کے دلوں کی آنکھوں پر کھوپے چڑھے ہیں کہ اب وہ قرآن میں تدبر، تفکر، فہم اور کسبِ فیض کے قابل نہیں رہے۔ پہلے دل کی آنکھوں پر کھوپہ چڑھتا ہے پھر سر کی آنکھوں پر بھی چھا جاتا ہے۔
دل کے کھوپے کا نام 'اکنہ'، کان کے کھوپے کا نام 'دقر' اور آنکھ کے کھوپے کا نام 'حجاب' ہے۔

غلاف:

غلاف کے ایک معنی ہیں کہ ہمارے دل خود علوم و معارف کے خزانے ہیں، ہمیں آپ کے علم و معارف کی ضرورت نہیں یعنی وہ اپنی عقل و فہم پر غرہ تھے۔ دوسرے کی بات خواہ وہ حق ہی ہو، سننے کو اپنی کسر نشان تصور کرتے تھے۔
دوسرے یہ کہ ہمارے دل غلافوں میں بند ہیں۔ اب 'اکنہ' اور 'غلاف' ہم معنی ہوں گے۔ بہر حال کوئی صورت ہو، دونوں کا حاصل یہ ہے کہ وہ قرآن میں غور و تدبر کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔
کفار کا کہنا یہ تھا کہ ہماری ہدایت خدا کو ہی منظور نہیں، ہمارا اس میں کیا قصور ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ غلاف کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ غلاف خود ان کے کفر و جود کا نتیجہ ہے۔ **بَلْ لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ**

حجاب:

حجاب سے مراد 'حائل اور مانع' ہے وہ مادی ہو یا معنوی۔ یہاں اس سے مراد وہ کیفیت ہے جو کفار کے دلوں اور فہم قرآن کے درمیان حائل اور مانع رہتی ہے۔
حجابِ رویتِ حق سے مانع ہے۔ اکنہ فہم قرآن میں حائل اور وقر سماعِ حق سے مانع کیفیت کا نام ہے۔

وقر:

وقر کان کے ثقل، بھاری پن اور بہرے پن کو کہتے ہیں جس طرح 'وسق' اونٹ کے بوجھ کو کہتے ہیں۔ اسی طرح 'وقر' دھے کے بوجھ کا نام بھی ہے۔
کان کا یہ 'وقر' انسان کو حق سننے کا اہل نہیں رہنے دیتا۔ قرآن حکیم نے آوازِ حق سے ان کے بدکنے کو **كَانَتْهُمْ حُمْرُ مُسْتَنْفِرَةٍ** گویا وہ گدھے ہیں جو بدکنے ہیں، سے تعبیر کیا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

یہ 'نقل اور بوجھ' جھوٹے وقار، سیاسی مصلحت اور منفعتِ عاجلہ کے شغف کا عموماً نتیجہ ہوتا ہے۔

غشادہ:

اس سے مراد وہ کھوپا اور پردہ ہے جو صرف آنکھوں پر پڑ جاتا ہے۔ یہ پردہ دل کے کھوپے اور پردے کا مظہر، نتیجہ اور عکس ہوتا ہے۔ پہلے دل پر اس کی سلطانی ہوتی ہے پھر اس کی وساطت سے آنکھ اسی رنگ میں رنگی جاتی ہے، کوتاہ بینی، کج بینی، کور چشمی سبھی اس کے مختلف انواع اور اسماء ہیں۔ یہ غشادہ اپنے تحت کو پوری جامعیت کے ساتھ ڈھانپ لیتا ہے۔ یہاں تک کہ 'دلِ کج' کی ہر کج ادا کے نظارہ میں آنکھ محو رہتی ہے لیکن جو 'حقائق' بے پردہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں وہ اسے دکھائی ہی نہیں دیتے۔

رین، رآن:

ران سے مراد زنگ ہے یعنی گناہوں کا، اگر اسے دھویا نہ جائے تو جس طرح لوہے کو زنگ کھا جاتا ہے، اسی طرح گناہوں کا زنگ بالآخر مجلسی اور مصفا دل کو کھا جاتا ہے یعنی گناہیوں محیط ہو جائیں کہ اس کے دل سے احساسِ زیاں بھی جاتا رہے۔ رین، کثرتِ گناہ سے دل سیاہ ہو جانے کا نام ہے۔ طبع اس پر ٹھپہ لگانے کو کہتے ہیں جو رین سے سخت ترین ہے اور اقبال، طبع سے بھی سخت ہے کہ اس سے دل مقفل ہو جاتے ہیں یعنی سیل ہو جاتے ہیں۔

غین:

غین بھی رین ہی ہے لیکن اس کا زنگ اس سے لطیف ہوتا ہے۔ یہ زنگ عموماً ادیبوں کے گناہوں اور دین پسند خوش فہموں کی خود فریبیوں کا حاصل ہوتا ہے یا صلحاء پر ایک انقباضی سی کیفیت ہے جو محض بشری اور ملکوتی ملکات کے درمیان کراسنگ کا نتیجہ ہوتی ہے مگر استغفار اور پیہم اعمالِ صالحہ کی بنا پر مغلوب رہتی ہے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے:

وانه لیغان علی قلبی وانی لا استغفر الله فی الیوم مائة مرة (مشکوٰۃ)

الغرض:

رین ایک سیاہ کاری اور سیاہ فہمی ہے جس سے دل کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ حیوانی دل تو سلامت رہتا ہے لیکن وہ دل مر جاتا ہے جس کے قریب رب کا بسیرا ممکن ہوتا ہے (نحن اقرب الیہ من حبل الوريد)

الغل:

اس کی جمع اغلال ہے۔ اس کے اصل معنی کسی چیز کو اوپر اوڑھنے یا اس کے درمیان میں چلنے جانے کے ہیں جو پانی درختوں کے درمیان میں بہہ رہا ہے، اسے بھی غلل کہتے ہیں اور اس طوق کو بھی "غل" کہتے ہیں جس سے کسی عضو کو کس کر اور جکڑ کر اس کے وسط میں باندھ دیا جاتا ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

وہ دلچسپیاں، مصلحتیں، اغراض اور رسومات ہیں جن میں ڈوب کر انسان راہِ حق کی طرف پلٹنے اور رجوع کرنے کی توفیق سے محروم ہو جاتا ہے۔ جیسے کسی نے اس کو جکڑ کر باندھ یا قید کر دیا ہو بس دل کی اس 'مانع عن الایمان' کیفیت یا محرومی 'کانام نعل' ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ: حق کی بات، ذکرِ خیر، اعمالِ صالحہ، ایمان، کتاب اور سنت کے نام سے اس بیمار کا دل، منقبض (بھنچے) ہونے لگتا ہے جیسے منوں بھار اس کے دل پر کسی نے رکھ دیا ہو یا جیسے اس کا گلا کسی نے دبا دیا ہو۔ بہر حال ختم (مہر) جیسی کیفیت ہے جو ختم سے چار درجے آگے ہے۔

سَد:

دیوار، آڑ اور رخنہ بند کرنے کو سد کہتے ہیں۔ یہاں وہ خدا فراموشِ شغف، کوتاہ بینی اور کم فہمی مراد ہے جن کی وجہ سے انسان نہ ماضی کے عبرت آموز واقعات سے کوئی درس لیتا ہے اور نہ حالیہ طرزِ زندگی کے عواقب اور انجام پر غور کرنے کی توفیق پاتا ہے۔ اس لئے اس کو کچھ سوچتا ہی نہیں۔ سورہ یٰسین میں اس کو یوں بیان فرمایا ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ

اور ہم نے ایک دیوار (تو) ان کے آگے بنائی اور ایک دیوار ان کے پیچھے اور اوپر سے دیا ان کو ڈھانک، تو (اب) یہ دیکھ ہی نہیں سکتے۔

قفل:

تالے کو کہتے ہیں۔ دل گویا دروازہ ہے۔ حق کے لئے اس کے انشراح اور تدبیر کے فقدان کو قفل (تالے) سے تعبیر کیا گیا ہے:

أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (پ ۲۶: محمد ع ۳)

یعنی کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا (ان کے) دلوں پر تالے (لگے) ہیں۔

اس آیت میں اسی کیفیت کا ذکر ہے۔ دروازہ کا بند ہونا بجائے خود بہت بڑا فتنہ ہے جب اس کے ساتھ اس کو مقفل بھی کر دیا جائے تو اس کے کھلنے کی امید باقی کیا رہ جائے گی۔ ہاں اس کی چابی خود انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ مگر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اپنی ناکردنیوں کے ہاتھ اس نے وہ 'چابی' بھی کھودی ہے جس سے اسے کھولا جاسکتا تھا۔

صمم:

حاسہ سماعت کے ضائع ہو جانے کا نام 'صمم' ہے۔ یہاں مراد ایسا شخص ہے جسے آوازہ حق سنائی دے نہ اسے قبول کرے بلکہ اپنی کہے اور اپنی ہی مرضی کرے۔ اس کو 'صدائے حق' سے یوں وحشت ہوتی ہے جیسے اس سے اس کو اپنے کان پھٹ جانے کا اندیشہ ہو۔

يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حُدُودَ النُّبُوتِ (پ ا ع ۳)

موت کے ڈر سے مارے کڑک کے انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونسے لیتے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اس آیت میں ان کی اسی وحشت اور حق سے ان کی اسی اجنبیت کا ذکر ہے۔ جہاں کیفیت یہ ہو وہاں قبول حق کی استعداد ختم ہو جاتی ہے۔

بک:

پیدائشی گونگے گوکم کہتے ہیں۔ اخرس عام ہے۔ پیدائشی ہو یا بعد میں کسی حادثے کا نتیجہ ہو سب کو اخرس کہتے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ بکم القلب اور بکم اللسان۔ دل کا گونگا اور زبان کا گونگا۔ دل کا گونگا (بکم) زبان کے گونگے سے سخت ہے۔ دل کے گونگے ہونے کے معنی ہیں کہ کلمہ حق کے قبول کرنے کی استعداد ہی نہ رہے۔

عمی:

اندھے پن کو عمی کہتے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ آنکھوں کا اندھا اور دل کا اندھا۔ یہاں یہی دل کے اندھے مراد ہیں کہ ان میں بصیرت کا فقدان ہے۔ اس لئے آنکھیں جو دیکھتی ہیں وہ اسے جچتی ہی نہیں۔

لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (ج رکوع ۵)

(سرکی) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں۔ سینہ کا مکیں دل ہی اندھا ہو گیا ہے۔

اس آیت میں اسی حقیقت کا ذکر ہے۔ یہ دل کی بینائی، سیاہ کرتوتوں کی وجہ سے ضائع ہو جاتی ہے۔ سیاہ اغراض اور سیاہ اعمال، بہر حال دل کی دنیا کے لئے حد درجہ مہلک ہیں۔

کان، آنکھ اور دل، علم و آگہی کے اصل ذرائع ہیں۔ کوئی شخص اگر ان کو اپنی بد عملی کے ذریعے خود ہی پھوڑ دے تو وہ جانے، کوئی کیا کرے؟ خدا نے ان کی اس بد نصیبی کا یوں ذکر کیا ہے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ أُذُنٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا (الاعراف-۲۳ع)

ان کے پاس دل (تو) ہیں، پر غور و فکر کے لئے نہیں، آنکھیں (تو) ہیں پر حقیقت بینی کے لئے نہیں، کان (تو) ہیں پر شنید حق کے لئے نہیں۔

صد:

رکنے اور روکنے کو کہتے ہی۔ یہ بد نصیبی کی انتہا ہے کہ خود بھی خیر کے قریب وجائے اور دوسرے کو بھی قریب نہ آنے دے، خدا نے اسے 'فراعنہ' کی ایک صفت قرار دیا ہے۔

زُيِّنَ لِلْفِرْعَوْنَ سُوءُ عَمَلِهِ وَصَدَّ عَنِ السَّبِيلِ (مومن: ۴)

یوں عموماً مشنری ٹائپ کے لوگ ہوتے ہیں جو حق کی راہ مارنے کو کار خیر یا سیاسی حکمت عملی تصور کرتے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

صرف:

اس کے معنی ہیں 'پھیر دینا' عموماً بطور نتیجہ کے قرآن میں اس کا ذکر ہے یعنی راہِ حق سے ان کے انحراف اور انصراف پر اصرار کا نتیجہ یہ نکلا کہ: اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کے رخ بھی ادھر کو ہی موڑ دیئے جدھر ان کے اغراضِ سیئہ کا رخ تھا یعنی اب ان کے دل میں احساسِ زیاں کی خلش بھی جاتی رہتی ہے:

وَإِذَا مَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ هَلْ يَرَوْا مِنْ أَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوا صَرَفَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ

اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو ان میں سے ایک طرف ایک دیکھنے لگتا ہے پھر (یہ کہہ کر کہ) کہیں تم کو کوئی دیکھتا تو نہیں (اٹھ کر) چل دیتے ہیں (یہ لوگ پیغمبر کی مجلس سے کیا پھرے) اللہ نے ان کے دلوں کو (دینِ حق سے) پھیر دیا۔ اس لئے کہ یہ لوگ ایسے ہیں کہ ان کو مطلق سمجھ نہیں ہے۔

امام ابن القیم فرماتے ہیں، صلاحیت اور قابلیت کا انحصار دو امور پر ہے۔ حسن فہم اور حسن قصد یہاں دونوں غائب ہیں۔ سمجھ بالکل غائب اور قصد براہی برا۔

سماع خاص سے محرومی کے اسباب بھی قرآن نے خود بیان فرمائے ہیں۔ کبر، توئی اور اعراضِ کبر سمجھنے سے مانع ہے، توئی جذبہ انقیاد اور اطاعت کے لئے مہلک ہے اور اعراضِ عطاءِ الہی سے محرومی کا باعث ہے۔

صرف یوں تصور کر لیجئے کہ ایک شخص موٹر، گاڑی یا جہاز سٹارٹ تو کرتا ہے مگر راہ پر نہیں، بلکہ ادھر ادھر آس پاس کے گڑھوں کی طرف، اس لئے موٹر کا ادھر کو دوڑ پڑنا اس کا 'صرف' اور قدرتی نتیجہ ہے کہ یوں تو یوں سہی! الغرض بری سمجھ اور ردی قصد، ضلالت اور شقاوت کا بنیادی نسخہ ہے۔

الشد والتقسیم:

الشد کے معنی 'سخت کر دینے' کے ہیں یعنی اے اللہ! ان کو یوں پتھر بنادے کہ اس کو چونک لگے ہی نہیں۔ بس وہی 'صد' جس کا اوپر ذکر ہوا:

رَبَّنَا اضْمِصْ عَلَيْنَا أَمْوَالَهُمْ وَاشْدُدْ عَلَى قُلُوبِهِمْ (یونس۔ ۹۷)

الہی! ان کے مالوں پر پانی پھیر دے اور ان کے دلوں کو (اور) سخت کر دے۔

یعنی اس مالی زیاں کی وجہ سے بھی ان کے دل 'موم' نہ ہوں۔ کیونکہ یہ بظاہر قبولِ حق کی ایک شکل محسوس ہوتی ہے، تاہم حقیقت میں اب بھی اس کا محرک مفادِ عاجلہ کے چر کے ہیں۔ رضاءِ الہی نہیں۔ اس لئے اب بھی پرنا لہ اپنی جگہ پر ہے، مگر دیکھنے والے اس سے دھوکا کھا سکتے ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ اس کو سخت کر کے اس پر ٹھپہ ہی لگا دے کہ یہ ظاہری فریب کی شکل بھی پیدا نہ ہونے پائے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

تفسیر:

تفسیر سے مراد پتھر جیسی سختی ہے اس کی ایک قراءت ’تفسیر‘ بھی ہے یعنی اغراضِ سیئہ کی ملاوٹ پر مبنی سختی ہو۔ **درہم قسیہ** اس وقت اس وقت کہتے ہیں جب اس میں کھوٹ ملا ہو گویا کہ یہ ’اشداء علی الکفار‘ کے قبیل سے نہیں ہوتی کیونکہ وہ مبنی برحق ہوتی ہے۔ وہ صلابت اور سختی استقامت علی الحق کی آئینہ دار ہوتی ہے لیکن تفسیر کی صلابت ایسی ’سنگدلی‘ کی آئینہ دار ہوتی ہے جو حق سے بے پرواہ رہنے کے لئے مددگار ثابت ہوتی ہے۔

ضلال بعید:

گمراہی ایک یہ ہے کہ راہ بھٹک جائے۔ دوسری یہ کہ غلط راہوں میں ہی کھو جائے۔ اگر ابتدائی درجہ کی ہے تو صبح کا بھولا شام کو واپس آسکتا ہے۔ اگر یہ انتہائی درجہ کی ہے تو واپس پلٹنے کی امید باقی نہیں رہتی۔ انہیں میں کھپ جاتا ہے یا آفات ناگہانی کی نذر ہو جاتا ہے۔ ضلال بعید سے مراد یہی دور کی گمراہی ہے کہ انسان کے رجوع الی الحق کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔ یہ بیماری عموماً سیاسی کھلنڈروں کو لاحق ہوتی ہے یا دین پسندوں کو۔ بہر حال قرآن میں ان ’ضلال‘ کے لئے عنوان نصاریٰ ہے۔ آپ دیکھ لیجئے کہ علم و فن میں اتنے اونچے چلے جانے کے باوجود حق کی طرف رجوع کرنے یا اس کے سمجھنے کی توفیق سے بالکل محروم ہیں۔

اغفال:

غفلت اس سہو کو کہتے ہیں جو تحفظ اور احتیاط کی کمی کے نتیجے کے طور پر طاری ہوتا ہے۔ جب اس پر اصرار جاری رہے تو یہ سہو حق سے مجرمانہ بے نیازی میں تبدیل ہو جاتا ہے جہاں ’احساس غفلت‘ بھی باقی نہیں رہتا۔ اسی کو ’اغفال‘ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مَنْ أَغْفَلْنَا عَنْ ذِكْرِنَا (کہف۔ ع ۴)

اجاڑ اور ویران شے کو بھی ’غفل‘ کہتے ہیں گویا کہ غافل کا دل ’حق سے خالی‘ ہو جاتا ہے، جیسے ایمان سے پہلے کیفیت تھی وہی عود کر آئی۔

المرض:

معتدل صحت میں کمی کا نام ’مرض‘ ہے روحانیت میں حق کا عرفان، اس سے صحیح تعلق اور ماسوا پر اس کو مقدم رکھنے کا نام ’صحت‘ ہے۔ شک، عدم تعمیل، جود اور انکار سے صحت ضائع ہو جاتی ہے۔ ریب اور شک منافقین کا مرض ہے، بد عملی اور نفسانی خواہشات کا ارتکاب عاصیوں کا مرض ہے۔ جب انسان ان کا خوگر ہو جاتا ہے تو یہ امراض بڑھتے ہیں۔ **فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا** (بقرہ ع ۲) میں اسی بات کا ذکر ہے۔ مرض یہ تیسرا درجہ ہے جس میں اصلاح کے امکانات تاریک ہو جاتے ہیں۔

تقلیب افکار:

نقلب افئدتہم و ابصارہم (انعام ع ۱۳)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو الٹ دیں گے۔

اُلٹے برتن میں کبھی کوئی چیز نہیں ٹھہرتی، بلکہ داخل ہی نہیں ہوتی۔ یعنی بہتی گنگا کے کنارے ان کے لب خشک ہی رہیں گے۔ اس لئے نہیں کہ شیریں پانی نہیں بلکہ صرف اس لئے کہ کسب فیض کی اہلیت نہیں رکھتے۔ دراصل یہ بھی 'ختم، مہر' کی ایک قسم اور نوع ہے۔ کیوں کہ جو لوگ سننے اور سمجھنے کے لئے تیار ہی نہیں ہیں، وہاں کوئی کیا کرے گلہ کا ہے اور شکوہ کس سے؟

الحول بین المرء وقلوبہ:

واعلموا ان الله يحول بين المرء وقلوبہ (انفال ع ۳)

تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ایک آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ بات یہ چل رہی تھی کہ اب ہم تمہیں بلارہے ہیں، آ جاؤ! جب ہم راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں گے تو پھر کسے جرأت کہ سر مو بھی کوئی آگے سرک سکے۔ وہ راستہ، بندے کا اس کے دل تک کا راستہ ہے جب کوئی ماسوائے اللہ کے لئے دل کی دنیا کا ٹریفک کھول دیتا ہے تو رب درمیان میں حائل ہو جاتا ہے جس کے بعد خود بندے کے لئے اپنے دل تک کی رسائی ناممکن بنا دی جاتی ہے۔

اگر بایں مسلمانی کہ دارم! مر از کعبہ مے راند حق اوست (ارمضانِ حجاز ص ۱۰۰)

ازاغۃ قلوب:

حق سے باطل کی طرف اور ہدایت سے ضلالت کی جانب مرعوبانہ جھکاؤ کا نام 'ازاغۃ' ہے۔ جب کوئی اللہ کے بجائے غیر اللہ سے مرعوب ہوتا ہے اور پھر اس کے حضور جھک رہتا ہے تو کچھ مدت کے بعد وہ اسی سمت کا ہو جاتا ہے اس لئے آپ نے ہر باطل تحریک، چکاچوند اور اس کے پجاریوں کا مشاہدہ کیا ہو گا کہ وہ جس قدر باطل پر ہوتے ہیں اتنے ہی اس پر پختہ بھی ہوتے ہیں۔ قرآن نے اس کو یوں بیان کیا ہے۔

فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ

جب وہ (خود غلط سمت کو) جھک گئے تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو اسی طرف جھکا دیا۔

خذلان:

وقت پر ساتھ چھوڑ دینے کو خذلان کہتے ہیں۔ یہاں مراد یہ ہے کہ:

اللہ تعالیٰ کسی سے توفیق سلب کر کے اس کو اپنے نفس و ہولے کے حوالے کر دے۔ ظاہر ہے کہ یہ حد درجہ خسارے کا سودا ہے۔ کیونکہ جب انسان خدا کے بجائے دوسروں کی رہنمائی اور آسروں کی ٹوہ میں پڑ جاتا ہے تو خدا کو غیرت آتی ہے۔ اس لئے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے تاکہ وہ اس کا انجام بھی دیکھ لے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

وان یخذلکم فمن ذا الذی ینصرکم من بعدہ (آل عمران۔ ع ۱۷)

اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کرے۔ میں اسی کا بیان ہے۔

ارکاس:

رکس کے معنی کسی چیز کو اس کے سر کے بل الٹا کر دینا یا اس کے اول سرے کو موڑ کر پچھلے سرے کے ساتھ ملا دینا ہے۔ یعنی فلاں گروہ جو بظاہر مسلمان بن رہا تھا واپس جا کر کافروں میں جا ملے۔

پہنچی وہاں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

گویا کہ یہ لوگ گوہم میں تھے، پریوں تھے جیسے ’سیدھے برتنوں میں اوندھا اور الٹا لوٹا۔‘ اس لئے تا آخر خالی رہے اور رہیں گے۔ کیوں کہ ان کے دل ’سچی طلب اور جذبہ اخلاص‘ سے بالکل محروم ہیں۔ اس لئے ان سے ’خیر‘ کی توقع کرنا عبث ہے۔

شبیط:

اس کے معنی روک دینے اور ہٹا دینے کے ہیں، چونکہ وہ دل سے نکلتا نہیں چاہتے تھے اس لئے ہم نے بھی انہیں رہنے دیا جسے خدا جامد رہنے دے اسے کون حرکت دے سکا ہے۔ اس آیت میں ان کی اسی محرومی اور کیفیت کا ذکر ہے۔

وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ اَنْبِعَاثَهُمْ فَثَبَّهَهُمْ (التوبہ۔ ع ۷)

لیکن اللہ نے ان کا اٹھنا پسند نہ کیا سو ان کو روک دیا۔

گویا کہ جو وہ چاہتے تھے، خدا نے اس کا اہتمام کر دیا۔

ترتین:

عمدہ، آراستہ اور حسین کر دکھانا، ترتین ہے۔ کام بد ہو، پر انسان اسے کمال، خوبی اور جوہر لا جواب تصور کرنے لگتا ہے تو ظاہر ہے اس کے لئے اپنے کردار یا زندگی پر نظر ثانی کرنا یا اس کا احتساب کرنا ممکن نہیں رہتا۔ یہ سیٹیج کسی کی آخرت، انجام اور مستقبل کو غارت کرنے کے لئے حد درجہ مہلک ثابت ہوتی ہے دراصل یہ کیفیت:

نُوَلِّهِ مَا تَوَلّٰی (نساء۔ ع ۱۷) جو (راستہ) اس نے اختیار کر لیا ہے اسی راستہ پر ہم بھی اس کو چلائے جائیں گے۔

کی ہو بہو تصویر ہے۔ جسے انہوں نے ’اچھا‘ سمجھا اسی میں ان کو لگن رہنے دیا۔

عدم تطہیر قلوب:

دل سے کفر و شرک اور بد عملی کی گندگی دور کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے ’حکمت عملی‘ تو بتا دی ہے۔ لیکن دھونے کی زحمت انسان کو خود ہی کرنی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ہے۔ اگر کوئی چاہے کہ یہ کام بھی خدا خود ہی کرے تو یہ بہت بڑی جسارت ہے۔ اس لئے فرمایا:
جو منافق ہیں جھوٹ کے دل دادہ، تحریف کتاب اللہ کے عادی، صرف مطلب اور گرد کی بات سے واسطہ رکھنے والے ہیں۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يُطَهِّرْ قُلُوبَهُمْ (پ۶. المائدہ. ع۶)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں کو پاک نہیں کیا۔
یہ عدم تطہیر دراصل ان کی بد عملی اور بد پرستی کا نتیجہ ہے اس کے معنی دلوں کو گندہ کرنا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ اگر وہ خود پاک نہیں کرتے تو پھر نہ سہی، والی بات ہے۔

امامہ القلوب:

دلوں کو مردہ کہنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ حق کی خواہش نہیں رکھتے۔ باطل سے نفرت اور حق و باطل میں امتیاز نہیں کرتے۔ اس لئے ایسے بیماروں کو قرآن نے موتی کہا ہے:

إِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَى (سورہ نمل ع۶) بے شک آپ مردوں کی باتیں نہیں سناسکتے

گویا یہ بھی توفیق الہی سے بالکلیہ محروم ہیں۔ جیسے ایک مردہ۔

ضیق صدر اور حرج:

ضیق صرف تنگی کو کہتے ہیں۔ حرج شدید ضیق (تنگی) کا نام ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے بنو بکر کے ایک شخص سے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بنو کنانہ کے ایک فرد سے پوچھا کہ، حرج کسے کہتے ہیں؟ گھنے جنگل والی وادی جس میں اتنی کثرت سے درخت ہوں کہ اس میں جانے کے لئے راہ نہ مل سکے، نہ راعی کو نہ جنگلی جانور کو۔ اس پر حضرت ابن عباس اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

كَذَلِكَ قَلْبُ الْكَافِرِ (شفاء العلیل ص ۱۰۶) کافر کے دل کی یہی کیفیت ہے۔

کہ اس میں خیر کا گزر ممکن نہیں رہتا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ جب وہ اللہ کا ذکر سنتا ہے اس کا دل گھٹنے لگتا ہے۔ اگر بتوں کی بات آجائے تو کشادہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کو کسی بد نصیب کی تنگی صدر مطلوب ہوتی ہے تو اس کو اتنا تنگ کرتا ہے کہ حق اس میں داخل نہیں ہو سکتا اس لئے وہاں مڑ جاتا ہے۔ ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ کچھ لوگوں کے سامنے حق کی بات آجائے تو یوں دب جاتے ہیں جیسے ان پر پہاڑ آ پڑا ہو۔ بہر حال حق کے سلسلے میں 'ضیق صدر' کا مریض حد درجہ تنگ دل ہوتا ہے۔ اس لئے کتاب و سنت سے کسب فیض کی کشش سے دور جا پڑتا ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

امساکِ نور:

یہی 'امساکِ نور' بھی ہے کہ شرح صدر کی دولت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اسلام میں قدم رکھتے ہوئے ہزاروں تاریک اور ڈراؤنے خواب آنے لگتے ہیں کہ خدا جانے کیا ہے؟

الغرض: **خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ** کے مفہوم کے لئے قرآن حمید نے جو مختلف اسلوب بیان اختیار کیا ہے۔ اوپر کی سطور میں اسی کا مختصر سا خاکہ پیش کر دیا گیا ہے جس سے ختم وغیرہ کی نوعیت محرکات، پس منظر، اسباب وداعی کی تفصیل بھی آگئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

ہدایت اور نور کی جو مشعلیں حق تعالیٰ نے روشن کی ہیں جو لوگ اغراضِ سیئہ کی بنا پر ان کی روشنی سے بدکتے ہیں کتراتے اور بھاگتے ہیں۔ خدا بھی ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے اور اپنی 'توفیق' کی خصوصی عنایات بھی ان سے چھین لیتا ہے کہ یونہی تو یونہی سہی۔ **نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّى** اس کے یہ معنی نہیں کہ خدا ان کے سامنے سے دروازہ بند کر دیتا ہے کہ وہ اندر نہ داخل ہوں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جو دروازہ وہ خود اپنے سامنے سے بند کر دیتے ہیں، خدا تعالیٰ جبراً وہ ان پر مکرر نہیں کھولتا یا کھول کر زبردستی ان کو اپنی طرف گھسیٹنے کی کوشش نہیں فرماتا کیونکہ سودا اختیار کا ہے۔ ٹھونسنے کی بات نہیں ہے۔ (مسل)

پروفیسر منظور احسن عباسی

سزائے مرتد پر چند مغالطے اور ان کا دفعیہ

(قسط ۴/ آخری)

قارئین جناب جسٹس ایس اے رحمان صاحب کی انگریزی تصنیف Punishment of Apostacy in Islam کے چیدہ چیدہ مقامات پر تبصرہ محدث کے صفحات پر ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ حالیہ شمارہ میں آخری قسط پیش خدمت ہے، جس کے ساتھ یہ خوشخبری بھی ہے کہ اسی موضوع پر جناب پروفیسر منظور احسن عباسی کی مفصل کتاب ”جرم ارتداد“ بھی عنقریب منظر عام پر آرہی ہے۔ (ان شاء اللہ) (ادارہ)

یہ کتاب اس قسم کے کمزور اور بے تعلق دلائل سے بھری پڑی ہے جس کی تفصیل کتاب ’جرم ارتداد‘ جو زیر طبع ہے، میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے مثلاً ایک بدو کا واقعہ کہ اس نے حضور کی بیعت کی، اس کے بعد اسے اتفاقاً بخار ہو گیا اس نے سمجھا کہ شاید بیعت ہی کی وجہ سے ایسا ہوا لہذا وہ بیعت توڑنے کے لئے حضور کی خدمت میں آیا اور کئی بار درخواست کرنے کے باوجود اس کی بیعت حضور نے نہیں توڑی اور جب (بغیر فسخ بیعت چلا گیا) تو حضور نے ارشاد فرمایا کہ مدینہ آگ کی بھٹی کی مانند ہے جو کثافت کو دور کر دیتا ہے۔

مدعا یہ تھا کہ یہ شخص بھی کثافت لے کر آیا لیکن شہر مدینہ کی برکت نے اس کی کثافت دور کر دی۔

مولف کتاب کا کہنا یہ ہے کہ اسے قتل کیوں نہ کیا گیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ مرتد کو قتل نہیں کیا جاسکتا یعنی اس کے باوجود کہ اس کے دل کی کثافت دور ہو گئی اس کو قتل کر دینا چاہئے تھا۔

ایک دلیل یہ ہے کہ صلح حدیبیہ میں ایک شرط یہ تھی کہ اگر کوئی مسلمان مرتد ہو کر مکہ میں پناہ لے تو اُسے اہل مکہ واپس نہ کریں گے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرتد کو قتل کیا جائے گا حالانکہ حدیث کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ اگر وہ مکہ میں پناہ نہ لیتا تو قتل کر دیا جاتا۔

ایک دلیل یہ ہے کہ قبیلہ لحم کے ساتھ معاہدہ میں یہ تھا کہ اگر ان میں سے کوئی مسلمان ہونے کے بعد اسلام سے پھر جائے گا تو خدا اور رسول اس کی جان و مال کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔

مولف کتاب کا ارشاد ہے کہ اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ مرتد کی سزا قتل ہے بلکہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کی جان محفوظ رہے گی نہ مال۔ میں کہتا ہوں کہ چلے یہی مان لیجئے لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت قتل نہیں کرے گی؟ باقی جس کا جی چاہے، قتل کر دے حکومت باز پرس نہ کرے گی۔ لیکن یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ مرتد مستلزم قتل نہیں ہے۔

ایک دلیل یہ ہے کہ ہر قتل نے ابوسفیان سے پوچھا تھا کہ کیا پیغمبر اسلام (ﷺ) کے متبعین ان سے پھر جاتے اور ان کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں؟ ابوسفیان کہتے ہیں کہ میں نے اس کے جواب میں یہ کہا کہ جو ان کا پیرو ہوا کبھی اس نے ان کو نہیں چھوڑا۔ فاضل مولف نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

سزائے مرتد پر چند مغالطے اور ان کا دفعیہ

مرتد کو قتل کا حکم ہوتا تو ابوسفیان کہتے کہ وہ تو قتل کر دیتے ہیں۔ لہذا ثابت ہوا کہ مرتد کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ابوسفیان سوال از آسمان اور جواب ربہماں دیتے تو قتل مرتد کا حکم ثابت ہو جاتا۔

ایک دلیل یہ ہے کہ تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا تو کچھ مسلمان مرتد ہو گئے تھے لیکن کسی کو قتل نہیں کیا گیا، لہذا ثابت ہوا کہ مرتد کو قتل نہ کرنا چاہئے لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس حکم کے نازل ہونے پر کون مرتد ہوا جسے قتل نہیں کیا گیا؟ یہ واقعہ ۲ھ کا ہے اور ابوسفیان کی گفتگو کا واقعہ ہے جس سے عیاں ہے کہ اس دوران کوئی مرتد ہوا ہی نہ تھا۔ یہ ارتداد محض موکف کتاب کی ذہنی تخلیق ہے۔

ایک دلیل یہ ہے کہ سورہ توبہ کی آیت ۷۴ میں بعض منافقوں کا ذکر ہے جو حضور کے خلاف ناشائستہ الفاظ کہتے تھے۔ شکایت ہوئی تو قسم کھا کر مکر گئے۔

موکف فرماتے ہیں کہ انہیں قتل نہیں کیا گیا جس سے ثابت ہوا کہ مرتد کو قتل کا حکم نہیں ہے۔ معلوم نہیں کہ منافق کے قتل نہ کیے جانے سے کس طرح مرتد کے قتل نہ کیے جانے کی دلیل حاصل ہوتی ہے۔

ایک اور دل چسپ واقعہ یہ ہے کہ ایک مسلمان مرتد ہو کر عیسائی ہو گیا اور (قبل اس کے کہ اسے قتل کیا جاتا) وہ مر گیا۔ عیسائیوں نے اسے دفن کر دیا۔ اگلے روز اس کی لاش قبر کے باہر پڑی ہوئی ملی۔ یہ واقعہ تین بار ہوا۔ عیسائیوں کو یہ شبہ تھا کہ یہ کام مسلمانوں کا ہے۔ یہ واقعہ بجائے خود اس امر کی دلیل ہے کہ مرتد واجب القتل ہے جس کو عیسائی بھی جانتے تھے کہ مسلمانوں کے نزدیک مرتد ہونا کتنا بڑا جرم ہے کہ اگر کوئی سزا سے بچ بھی جائے تو متے دم تک مسلمان اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

اس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ فرمانا کہ مرتد مستوجب سزا نہیں ہے بجز خوش فہمی کے اور کیا ہے۔

ایک واقعہ یہ ہے کہ بادشاہ یمامہ نے دو شخصوں مجاہد اور رجال کو خدمت اقدس ﷺ میں یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اگر آپ اس کو حکومت کا جانشین بنالیں تو وہ مسلمان ہو جائے گا۔ یہ دونوں اشخاص حضور کی خدمت میں آکر مسلمان ہو گئے۔ رجال تو یہیں رہ گیا اور مجاہد واپس جا کر مرتد ہو گیا اور مسلمانہ کے ساتھ مل گیا۔

موکف کتاب کا ارشاد ہے کہ اسے قتل کیوں نہ کر دیا گیا۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ کون قتل کرتا؟ کیا مسلمانہ؟ پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ مسلمانہ کے ساتھی سبھی قتل ہو گئے تو اس کے قتل نہ کیے جانے کا کیا ثبوت ہے؟

ایک حیرت ناک خلاف بیانی یہ کی گئی ہے کہ پروفیسر بیفنگ نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں لکھا ہے کہ:

”آنحضرت ﷺ نے مرتدوں کو معاف کر دیا۔“

لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ حضور نے کبھی مرتد کو معاف کیا نہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں یہ مذکور ہے۔ نہ نسائی، ابوداؤد اور تفسیر طبری وغیرہ میں جس کا حوالہ دیا گیا ہے، کہیں مرتد کے معاف کرنے کا ذکر ہے۔ اس کے برعکس انسائیکلو پیڈیا کے مصنفین نے بتایا ہے کہ اسلام میں مرتد مستوجب سزائے موت ہے۔ ہاں مرتد اگر مسلمان ہو جائے تو معاف کیا جاسکتا ہے اور یہی بتایا گیا ہے ملاحظہ ہو لفظ مرتد۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ان عجیب و غریب اور قطعاً غیر منطقی استدلالات کے بعد جناب مولف کا ارشاد ہے کہ:
’راخ العقیدہ یا تقلید پسند علماء کی زبردست روایات کی موجودگی میں بھی اگر احادیث تقویت نہیں پہنچتی کہ اگر کوئی دین سے پھر جائے تو وہ سزائے موت کا مستوجب ہے۔‘ (ص ۸۶)

اب ملت اسلامیہ کی بد قسمتی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال کے عرصہ میں تاریخ کی روشنی میں گہری نظر سے احادیث کا مطالعہ کرنے والا ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوا جو اسلام کے اس نکتہ لطیف کو سمجھ سکتا۔ جس کے باب میں مولف کا ارشاد یہ ہے کہ قرآن حکیم کے واضح احکامات سے ثابت ہے کہ مرتد کی کوئی سزا نہیں ہے۔

احادیث کے بعد آثار خلفائے راشدین سے بھی انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرتد کی سزائے قتل اسلام کے خلاف ہے۔
ان کے دلائل کا خلاصہ ملاحظہ ہو:

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتدہ عورت ام فرقہ کو قتل کا حکم دیا لیکن وہ حکم ارتداد کی بنا پر نہ تھا بلکہ وہ محاربہ تھی۔
اسی طرح مدعیان نبوت اسود غنسی اور مسیلمہ کذاب اور ان کے ساتھیوں کو جو خلیفہ اول نے قتل کا حکم دیا وہ بھی ارتداد کی بنا پر نہیں بلکہ بغاوت کی بنا پر تھا۔

اس کے علاوہ قبیلہ بنو اسد اور ایک شخص لقیظ بن یزیدی کے مرتد ہو جانے کا ذکر کیا ہے اور یہ تسلیم فرمایا ہے کہ ان کے خلاف خلیفہ اول نے لشکر بھیج کر ان کا خاتمہ کر دیا لیکن ان کا کہنا ہے کہ یہ سب باغی تھے اس لئے قتل کئے گئے۔ یعنی مرتد ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ بغاوت کی بنا پر قتل ہوئے۔
لیکن یہ مرتد کی سزائے قتل کے خلاف کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ گویا ارتداد بغاوت کا پیش خیمہ ہے لیکن قتل نہ کیے جانے کا کوئی ثبوت اس سے بھی نہیں نکلتا۔

اس کے بعد بحوالہ ترجمہ تاریخ طبری ج ۳ (جو دراصل ج ۲ ہے) لکھا ہے کہ ایک شخص عیینہ بن حصن جو مرتد ہو گیا تھا خلیفہ اول نے اسے معاف کر دیا لہذا مرتد کی سزا اسلام کے خلاف ہے۔ اول تو معاف کرنے کا لفظ ہی یہ بتاتا ہے کہ وہ مستوجب سزائے قتل تھا۔ پھر معاف کرنے کا سبب بھی بتایا گیا ہے جسے مولف کتاب نے درج نہیں فرمایا، کہ جب اس سے کہا گیا کہ:

”اللہ کے دشمن! ایمان لانے کے بعد تو کافر ہو گیا، اس نے جواب دیا کہ میں آج تک اللہ پر ایمان ہی نہیں لایا تھا۔“ (ملاحظہ ہو ترجمہ طبری)

معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہی نہ ہوا تھا تو مرتد ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
مولف کتاب کی انصاف پسندی ملاحظہ ہو کہ وہ اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس سے عیاں ہے کہ مرتد کے لئے کوئی طے شدہ سزا نہیں ہے۔

عہد خلافت اولیٰ کی ان واقعات سے غایت مافی الباب جو امر ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ارتداد اور بغاوت لازم و ملزوم ہیں لیکن یہ کسی طرح نہیں کہا جاسکتا کہ مرتد واجب القتل نہیں ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

جناب مؤلف نے لکھا ہے کہ حضرت عمر نے حضرت عمرو بن العاص کو ایک مرتد شخص کے بارے میں یہ حکم لکھ کر بھیجا کہ 'جتنی بار بھی وہ توبہ کرے اسے تسلیم کر لیا جائے اور آخر میں اسلام پیش کیا جائے اگر اس کی پیروی سے انکار کرے تو اس کی گردن ماری جائے۔' تعجب ہے کہ اس حکم سے بھی وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مرتد کو قتل کا حکم نہیں ہے ورنہ بار بار اس کی توبہ قبول کرنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ لیکن وہ یہ وضاحت نہ فرما سکے کہ آخر میں جو گردن کاٹنے کا حکم ہے، وہ کس جرم کی پاداش میں ہے۔

شاید اس کا جواب بن نہ پڑنے کے باعث انہوں نے حضرت عمرؓ کے اس حکم کو خلاف قرآن ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (تفصیل میری کتاب 'جرم ارتداد' میں ملاحظہ ہو)

عہد خلافت ثانیہ کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص نے حضرت عمر کو اطلاع دی کہ ایک عرب مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو گیا تھا اسے قتل کر دیا گیا۔ اس پر خلیفہ ممدوح نے لکھا کہ: 'قتل کرنے سے پہلے تمہیں چاہئے تھا کہ اسے کوٹھڑی میں بند کر دیتے اور ہر روز ایک روٹی کا ٹکڑا دے دیتے، بہت ممکن تھا کہ وہ توبہ کر لیتا۔' (یعنی توبہ کے بغیر اس کا زندہ رہنا ممکن نہ تھا)

باوجود اس کے جناب مؤلف بغیر کسی دلیل کے اس بات پر اڑے ہوئے ہیں کہ اس کو جرم ارتداد میں نہیں بلکہ حربی ہونے کے جرم میں قتل کیا گیا تھا۔

ایک اور واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابو موسیٰ کے فرستادہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا کہ حاجبہ اور بکر بن وائل اور اس کی جماعت کے لوگ جو مرتد ہو گئے تھے ان کا کیا حشر ہوا، حضرت انس نے فرمایا کہ وہ سب قتل کر دیئے گئے۔ اس پر خلیفہ ثانی نے فرمایا کہ اگر ان کو زندہ گرفتار کیا جاتا تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔ میں ان سے کہتا کہ جس دروازے سے تم باہر آئے ہو وہ اب بھی کھلا ہے وغیرہ۔ تاہم ان کے قتل کو امیر المؤمنین نے قتل ناحق قرار نہیں دیا بلکہ قتل برحق قرار دیا کیونکہ کوئی باز پرس نہیں فرمائی۔ لیکن جناب مؤلف یہی فرماتے جارہے ہیں کہ ان کو بھی حربی ہونے کے جرم میں قتل کیا گیا۔

عہد خلافت ثانیہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ کچھ لوگ مسجد نبوی میں بیٹھ کر مسلمانہ کی نبوت کی تصدیق کر رہے تھے۔ حضرت عمر نے حضرت عبداللہ بن مسعود کو ان کے بارگاہ خلافت میں پیش کرنے کا حکم دیا سب نے توبہ و استغفار کیا تو چھوڑ دیئے گئے اور ان سے وعدہ لیا گیا کہ آئندہ ایسی حرکت نہ کریں۔ ان میں سے عبداللہ بن نواح کو قتل کر دیا گیا۔ یہ وہ شخص تھا جو مسلمانہ کا پیغام لے کر حضور ﷺ کے پاس آیا تھا اور حضور نے فرمایا تھا کہ اگر یہ بطور سفیر کے نہ آیا ہوتا تو اسے قتل کروادیتا لیکن اس بار وہ نہ بچ سکا۔

اس کے بعد مؤلف کتاب نے عہد خلافت ثانیہ کے اس واقعہ کا سہارا پکڑا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک لونڈی ام ولد کو جس نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا قتل کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ اسے ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کر دینے کا حکم دیا جو عیسائی نہ ہو۔ لیکن اس دلیل کی بنیاد ہی غلط ہے۔ عورت کو قتل کرنے کا حکم نہیں بلکہ تعزیر کا حکم ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

سزائے مرتد پر چند مغالطے اور ان کا دفعیہ

مرتد کی سزائے قتل کا ثبوت عہدِ خلافتِ ثالثہ سے بھی ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ قطعی اور واضح ارشاد ہے جسے خود جناب مؤلف نے نقل فرمایا ہے کہ:

’جو شخص بھی ایمان لانے کے بعد اس سے پھر جاتا ہے اسے قتل کر دیا جائے۔‘ (ص ۹۷)

اور اس پر بھی یہ ارشاد ہے کہ اس حکم میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ کن حالات میں وہ شخص واجبِ القتل ہے۔ یعنی یہ جو وضاحت کی گئی ہے کہ جو شخص ایمان لانے کے بعد اس سے پھر جائے وہ مستوجبِ قتل ہے۔ یہ وضاحت نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک وضاحت کا صرف ایک ہی مفہوم ہے کہ اس میں یہ بتایا جائے کہ اسلام سے پھر جانے کے بعد وہ حربی ہو گیا تب واجبِ القتل ہو گا۔ لیکن اگر ایسی وضاحت کی جاتی تو میرے خیال میں یہ ایک احقانہ حکم ہوتا کیونکہ کوئی حربی واجبِ القتل نہیں بلکہ واجبِ القتال ہے۔ قتل کا حکم صرف جرم کی سزا کے طور پر ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کا اعتراف خود مؤلف کتاب کو بھی ہے۔

پھر یہ ارشاد بھی عجیب ہے کہ حضرت عثمانؓ کے اس حکم میں قرآن یا سنت کے کسی فیصلہ کا ذکر نہیں ہے۔ شاید مؤلف کتاب موصوف کا یہ خیال ہے کہ حضرت عثمانؓ نے یہ حکم کتاب و سنت کے خلاف دے دیا اس لئے ناقابلِ تسلیم ہے۔ حیرت ہے کہ ضد اور بے جا پاسداری انسان کو کس مقام پر پہنچا دیتی ہے۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے تین بار ایک شخص سلیمان بن موسیٰ کو ارتداد سے باز آنے کے لئے کہا۔ اس نے نہ مانا۔ آخر قتل کر دیا گیا۔

جناب مؤلف کا ارشاد ہے کہ جن حالات میں یہ حکم دیا گیا تھا وہ تاریکی میں ہیں اور یہ تاریکی اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ تسلیم نہ کیا جائے کہ وہ شخص محارب تھا جس سے تین بار خلیفہ ثالث نے ارتداد سے باز آنے کو کہا لیکن وہ نہ مانا لہذا قتل کر دیا گیا۔ تعجب ہے کہ خلیفہ ممدوح نے حرب سے باز آنے کی بجائے ارتداد سے باز آنے کو کہا حالانکہ بخیاں مولف ارتداد امر مستوجبِ قتل ہے ہی نہیں۔ پھر یہ کون پوچھے کہ کیا اہل حرب کو اس طرح بار بار مشورہ دینا ممکن تھا؟

ایک اور واقعہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے حضرت عثمانؓ سے عراق کی ایک مرتد ہو جانے والی جماعت کی بابت حکم دریافت فرمایا۔ خلیفہ ممدوح نے لکھا کہ انہیں اسلام پیش کرو، انکار کریں تو قتل کر دو۔

مؤلف محقق فرماتے ہیں کہ وہ بھی اہل قتال ہی تھے۔ اور دلیل یہ دی ہے کہ اخبار ’زمیندار‘ کے کسی پرچہ میں کسی نے لکھا ہے کہ ایک روایت میں **اقتلوا** کی بجائے **قاتلوا** آیا ہے جس سے عیاں ہے کہ وہ لوگ اہل قتال تھے مستوجبِ قتل نہ تھے۔ جناب ممدوح کا مطلب یہ ہے کہ اگر **اقتلوا** ہوتا تو بے شک یہ ثابت ہو جاتا کہ وہ صرف مرتد تھے۔ اہل حرب نہ تھے۔ لیکن تعجب ہے کہ نکتہ انہیں ان تمام روایات کو بیان فرماتے ہوئے ذہن سے اتر جاتا ہے جن میں **اقتلوا** آیا ہے، **قاتلوا** نہیں ہے اور لطف یہ ہے کہ اس روایت میں بھی **اقتلوا** ہی ہے کسی نے غلطی سے **قاتلوا** لکھ دیا تو وہ حجت نہیں ہے اور **قاتلوا** سے بھی مرتد کی سزا موت ہی ثابت ہوتی ہے۔ اس کی بریت تو کسی طرح بھی ثابت نہیں ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد خلافت کے واقعات کو لیجئے۔ سب سے پہلے جناب موکف نے حضرت علیؑ کی خارجیوں کے ساتھ جنگ کا ذکر کیا ہے، جنہیں ارتداد ہی کی بنا پر قتل کیا گیا ص ۹۹ لیکن موکف کی تحقیق یہ ہے کہ وہ مسلمان تھے اور خود حضرت علیؑ بھی انہیں مسلمان سمجھتے تھے۔ گویا حضرت علیؑ کا انہیں قتل کرنا مرتد کا قتل کرنا نہیں بلکہ قتل مسلم کی نظیر ہے جس میں حضرت علیؑ کو ملوث قرار دیا گیا ہے اور صرف اس لئے کہ کہیں مرتد کو مجرم نہ قرار دیا جاسکے۔

دوسرا واقعہ زندیقوں کو حضرت علیؑ کے حکم سے زندہ جلانے کا ہے ص ۹۹ جس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ اگر میں ہوتا تو انہیں نہ جلاتا بلکہ قتل کرتا کیوں کہ حضرت کا ارشاد ہے:

من بدل دینہ فاقتلوه

جناب موکف نے اس پر بھی تنقید فرمائی ہے کہ اول تو یہ روایت ہی قابل اعتبار نہیں اور اگر صحیح مان لی جائے تو یہ لوگ ابن سبا کے پیرو تھے جو نظام کو درہم برہم کرنا چاہتے تھے اس لئے قتل کئے گئے حالانکہ حضرت ابن عباس جس بنا پر قتل کا مستوجب سمجھتے تھے وہ ارتداد یا تبدیلی مذہب ہے جس کا ذکر حدیث میں ہے۔ عرض اس سے بھی ان کا واجب القتل نہ ہونا ثابت نہ ہوا۔ (مزید تفصیل کے لئے کتاب ”جرم ارتداد“ ملاحظہ فرمائیے)

عہد حضرت علیؑ کا ایک واقعہ یہ ہے ص ۱۰۱ کہ قبیلہ بنی نجیہ میں سے ایک گروہ مسلمان ہو گیا۔ ایک گروہ بدستور عیسائی رہا۔ ایک گروہ مسلمان ہو کر پھر مرتد ہو گیا۔ آخر الذکر سے اسلام کے لئے کہا گیا۔ اس نے انکار کیا لہذا ان سب کو جرم ارتداد کی پاداش میں قتل کر دیا گیا۔ موکف کتاب کا یہ ارشاد ہے کہ اس واقعہ سے ان لوگوں کے خیال کو کوئی تقویت نہیں پہنچتی کہ ارتداد جرم ہے محض ایک معصیت آلود خطا نہیں ہے لیکن اس واقعہ سے اس خیال کو کیسے تقویت پہنچتی ہے کہ ارتداد نہ جرم ہے نہ امر قابل تعزیر؟

ایک اور واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتد عیسائی حضرت علیؑ کے سامنے پیش کیا گیا اس نے آپ کے کان میں کچھ کہا لیکن قتل کر دیا گیا۔ موکف کتاب فرماتے ہیں کہ وہ بھی محارب تھا یعنی محارب ہونے کے باوجود حضرت علیؑ کے کان میں گفتگو کا موقع پا گیا۔ ان دلائل کے علاوہ مختلف دلائل اوٹ پٹانگ ہیں۔ اختصار کے پیش نظر اس کی تفصیل ترک کر دی گئی ہے۔

موکف کتاب کا سب سے زیادہ دشوار مرحلہ فقہاء کے خلاف قتل مرتد کو خلاف اسلام ثابت کرنا تھا۔ اس کے لئے سب سے پہلے انہوں نے یہ تسلیم فرمایا ہے کہ:

”تمام فقہاء نے بالاتفاق ارتداد کی سزا قتل قرار دی ہے۔“ ص ۱۲

باوجود اس اعتراف کے وہ خود فقہاء کے اس فیصلہ کے خلاف ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمام فقہاء کی آنکھوں میں دھول جھونک کر دور کی کوڑی لائے ہیں اور تحقیق احکام اسلامی میں اس قدر آگے نکل گئے ہیں کہ تمام زعمائے امت ان کے گرد راہ بن کر رہ گئے ہیں۔ یہ ہے ان افراد ملت کی ایک مختصر فہرست جنہوں نے سزائے جرم ارتداد میں غلطی کی ہے:

حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عکرمہ، حضرت ایوب، حماد، محمد بن الفضل، ابو النعمان،

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

سزائے مرتد پر چند مغالطے اور ان کا دفعیہ

ابو موسیٰ، ابو بردہ، حمید بن بلال، قرۃ بن خالد، یحییٰ، مسدد، حضرت ابو ہریرہ، ابن عبد اللہ، ابن عتبہ، عبید اللہ، بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، امام مالک، محمد خطیب بغدادی، ابو حنیفہ، شافعی، احمد بن حنبل، ابو بکر جصاص، ابن العربی، امام بیضاوی، جلال الدین سیوطی، ابن حیان، ابن اکثیر، خازن بغداد، جریر طبری، زحشری، رازی، آلوسی، محمد ابراہیم البغدادی (صاحب خازن)، ابن الہمام، چلبی، علامہ شہیر سید قطب مصری، علامہ شلتوت، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، مولانا اشرف علی تھانوی، شیخ اسماعیل حنفی، امام ابن تیمیہ، شیخ عبد القادر جیلانی، شاہ عبد القادر، شیخ سعدی۔

یہ وہ اصحاب ہیں جن کے فیصلے کتابوں میں درج ہیں اور جو راقم الحروف کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی ایسا عالم دین نہ سننے میں آیا اور نہ پڑھنے میں جس نے آنحضرت ﷺ کے اس حکم کے خلاف آواز اٹھائی ہو کہ ”**من بدل دینہ فاقتلوہ**“ بد قسمتی سے پاکستان ہی کا ایک شخص کہتا ہے کہ یہ ملا کا قول ہے۔

فاضل موکف نے اس بے رحمی سے حدیث کو رد نہیں فرمایا تاہم زیر تنقید کتاب میں اس خیال کی تائید فرمائی ہے کہ مرتد کی سزائے قتل اسلام اور قرآن کے خلاف ہے لیکن یہ کہہ کر انہوں نے غیر شعوری طور پر ان تمام اصحاب کی توہین کر ڈالی ہے کیونکہ اس ارشاد کے معنی سوا اس کے اور کچھ نہیں ہیں کہ:

تمام ابطالِ ملت قرآن اور اسلام کے سمجھنے میں قاصر رہے۔ تاہم انہوں نے ان کے اس تصورِ فہم کا یہ سبب جو بیان فرمایا ہے وہ ان حضرات کے لئے عذرِ گناہ بدتر از گناہ کے مصداق ہے۔ ص ۱۲۷

”رسالتِ مآب ﷺ یا خلفائے راشدین کے زمانہ میں جن مرتدین کو قتل کیا گیا۔ ان میں سے بیشتر وہ تھے جنہوں نے حکومت کے خلاف بغاوت نہیں کی۔ یہ نہیں فرمایا وہ کون کون سے اصحاب تھے اور ان کا کیا حشر ہوا؟) چنانچہ ان ایام میں یہی خیال کیا جاتا تھا کہ جو شخص اسلام سے پھر گیا وہ دشمنانِ اسلام کے ساتھ مل گیا اور تاریخ بھی اس کی تصدیق کرتی ہے جس کی وجہ سے قدمائے فقہاء کی تحریروں میں (یعنی فقہائے متاخرین و حال کی تحریروں میں نہیں) ان مرتدوں کے درمیان جنہوں نے محض مذہب تبدیل کیا اور وہ مرتدین جو ملک کے دشمن بھی ہو گئے امتیاز نہیں کیا گیا اور ایک عرصہ کے بعد یہی قانون بنالیا گیا کہ مرتد اگر توبہ نہ کرے تو اسے واجب القتل قرار دیا جائے۔“

فاضل موکف کتاب اب اس قانون میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں اور اس کی ضرورت یوں محسوس فرمائی کہ قتل مرتد قرآن حکیم کے صریح حکم کے خلاف ہے اور سنت سے بھی اس کی تائید نہیں ہوتی۔ گویا فقہانے جو قانون بنایا وہ قرآن کے صریحاً خلاف ہے اور سنت کے بھی خلاف ہے۔ خلاصہ ان کے دلائل کا یہ ہے کہ وہ قرآن کو نہیں سمجھے اور احکام سنت کے پس منظر سے آنکھیں بند کر کے یہ قانون بنالیا اور اس جوشِ اصلاح میں انہوں نے کم از کم چار ایسے اشخاص کے نام بتائے ہیں جن کو وہ اپنا ہم خیال تصور فرماتے ہیں۔ ان میں ایک ابن حیان اندلسی، دوسرے شیخ محمد شلتوت، تیسرے ابن الہمام اور چوتھے چلبی۔

اس عاجز نے اس مضمون کی پہلی قسط (رسالہ محدث اشاعت ماہِ رجب شعبان ۱۳۹۳ھ) میں بتایا ہے کہ ان اصحاب پر یہ الزام ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے مرتد کی سزا قتل قرار دی ہے اور اس کو عین انصاف بتایا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ علامہ محمد شلتوت کی تحریروں کو جو صراحتاً قتل مرتد کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

حامی ہیں اور جس کی تفصیل انہوں نے وضاحت سے کر دی ہے، نظر انداز کر کے جناب مؤلف نے اپنی ایک تحریر میں شیخ ثلثوت کی ایک اور عبارت کو غلط معنی پہنا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ وہ محض ارتداد کو جرم مستلزم سزائے موت نہیں سمجھتے تھے۔ علامہ موصوف کی تفسیر میں ایک جگہ یہ درج ہے:

الکفر وحده ليس مبيحا للدم وانما يبيحه الاعتداء

یعنی محض کافر ہونا مستوجب قتل نہیں ہے بلکہ اعتداء موجب قتل ہے۔

لفظ اعتداء کے معنی ظلم اور تعدی کے ہیں اور وہ مرتد ہو جانے کو بھی دین پر ظلم تصور فرماتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے لکھا ہے:

عقوبة الاعتداء على الدين بالردة

یعنی مرتد کو جو سزا دی جاتی ہے وہ دین پر ظلم کرنے کی وجہ سے ہے۔

چنانچہ انہوں نے اس حدیث نبوی کی تفسیر فرمائی ہے جس میں حضور نے تین اشخاص کو مستوجب قتل قرار دیا ہے۔ قتل ناحق کرنے والا، شادی شدہ ہو کر زنا کرنے والا، اور دین اسلام سے مرتد ہو جانے والا۔ ان تینوں کے جرائم کو اعتداء سے تعبیر فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ قتل صرف تین صورتوں میں قرین عدل ہے:

الاعتداء على النفس الاعتداء على النظام العالم الاعتداء على الجماعة المسلمين

یعنی کسی کی جان پر ظلم کرنا، نظام عالم یا معاشرتی نظام پر ظلم کرنا یا مسلمانوں کی جماعت پر ظلم کرنا۔

اس میں تینوں جرائم کو اعتداء سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

فاضل مؤلف نے یہ نتیجہ اخذ فرمایا کہ جرم کے ساتھ جو اعتداء کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک مرتد دشمنی پر نہ اتر آئے اسے قتل نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہی لفظ قاتل اور زانی کے لئے بھی ہے، تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ زانی محسن اور قاتل بھی جب تک مسلمانوں کے خلاف حربی نہ ہو جائیں ان کو قتل نہ کیا جائے گا۔

غرض یہ آشفتہ بیانی صرف اس اصرار کا نتیجہ ہے جو جناب مؤلف کو مرتد کے مستوجب سزائے موت نہ ہونے پر ہے۔

اس کے علاوہ بعض دوسرے فقہاء و علماء پر اس قسم کے الزامات ہیں، جن کی تفصیل میرے رسالہ 'جرم ارتداد' میں ملاحظہ فرمائی جائے۔ جناب مؤلف کی اس تالیف کا سب سے زیادہ افسوسناک حصہ وہ ہے جس میں غلط بیانی یا الزام تراشی سے کام لیا گیا ہے، چنانچہ کتاب زیر تنقید کا آخری فقرہ بھی ایک بہت بڑی غلط بیانی ہے کہ:

”پیغمبر اسلام ﷺ کی عظیم الشان سنت کسی طرح بھی اس کے خلاف نہیں ہے (کہ اسلام سے پھر جانے والے کو اس دنیا میں کوئی سزا نہ دی جائے۔)“

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

تعلیم و تبلیغ، مسلم اقلیتوں، تارکین وطن اور اسلامی قانون کی تدوین کے مسائل پر اہم مباحث

اسلامی استحکام مخلصانہ سماجی خدمات اور خالص اسلامی تعلیمات سے ہی ممکن ہے

(بلسلسلہ عالم اسلام کے ممتاز علمائے کرام کے ایک کنونشن کی کارروائی)

استاد علال فاسی لکھتے ہیں کہ جب مغرب میں فرانسیسی استعمار روبہ زوال تھا تو مبشرین نے اپنے طریقہ کار میں تبدیلی کی اور 'آزادی' فکر اور بحث مباحثہ کے مراکز قائم کئے۔ ان میں سے ایک مرکز، جس کو بڑی اہمیت اور شہرت حاصل ہوئی، وہ تھا جو رباط تیو ملیین (Monster de Toumliline) کہلاتا تھا۔ پیرس، امسٹرڈم اور بون (جرمنی) میں انجمنیں قائم تیں، جو مذہبی فریضہ کے طور پر اس رباط کو مالی وسائل فراہم کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ مسلمان، عیسائی، یہودی، کمیونسٹ، بے دین ملحد سب اس مرکز میں جمع ہونے لگے اور کوئی موضوع ایسا نہ تھا جو ان کے دائرہ بحث سے خارج ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسانیت کے رشتہ میں بندھے ہوئے سب کے سب 'حقیقت' کی تلاش اور جستجو میں ہیں اور اس تلاش اور جستجو کی خاطر انہوں نے دین، اخلاق، قومی روایات کے تمام بندھن توڑ دیئے ہیں۔ بس یہی اس مرکز کے قیام کا اصل مقصد تھا کہ مسلمان تعلیم یافتہ نوجوان اپنے دین، اخلاق اور قومی روایات کے باہر حقیقت کی تلاش میں لگ جائے، بلکہ دین، اخلاق اور قومی روایات کو حقیقت کی جستجو میں سبک راہ سمجھنے لگے۔ ذرا خیال تو کیجئے کہ یہ حقیقت کے شیدائی اور آزادی فکر کے علمبردار مغربی مجاہدین کی جنگ آزادی کا تماشہ دیکھتے ہیں اور ان کی حمایت میں ایک کلمہ بول کر نہیں دیت یہ بات بار بار دہرانے، یاد رکھنے اور سبق لینے کی ہے کہ ایک طرف استعمار اور تبشیر اور دوسری طرف کمیونسٹ اور بائیں بازو کی ساری جماعتیں، ان میں سے کسی نے مغرب اور شمالی افریقہ کے مسلمانوں کی جنگ آزادی کا قولاً فعلاً کسی طرح ساتھ نہیں دیا۔ یہ ناقابل انکار شہادت علال فاسی کی ہے جس مغرب کی جنگ آزادی کے قائدین میں سے ہیں۔

آخر ایسا کیوں؟ ویت نام اور الجزائر اور مغرب میں کونسا فرق ہے؟ امریکہ کے اڈے مغرب میں بھی تھے اور وہ بھی استعمار کی پشت پناہی کے لئے تھے بس فرق صرف اتنا ہے کہ الجزائر اور مغرب کے مجاہد مسلمان تھے، اور ہیں اور اسلام دشمنی استعمار تبشیر اور کمیونزم، فرانس، امریکہ اور روس سب کا مشترکہ مقصد ہے۔ اتنا کہتا چلوں کہ ہمارے 'اشتراکی کوچہ گرد' شاعر و افسانہ نویس اور نعروں پر جینے اور مرنے والے بے شوق اور بد ذوق طالب علم (جنہوں نے جامعہ کی لائبریری کے در و دیوار کو بے معنی اور انتہائی بد خط سیاہ اور سرخ نعروں سے داغدار بنا رکھا ہے) یہ کاگوا اور ویت نام پر تو تلملا اٹھتے ہیں۔ کیا ان میں سے کسی نے اس پہلو پر سنجیدگی سے غور کیا ہے؟ وسط ایشیا کے مسلمان اگر آہ و زاری بھی نہیں کر سکتے تو یہ روس کی حکمت عملی ہے۔ لیکن کاسیاسی تدبیر اور حسن سلوک ہے! اجتماع میں کئی ایسی ممتاز علمی اور سیاسی شخصیتیں شریک تھیں جنہوں نے وسط ایشیا کے مسلمانوں کے احوال کا دیدہٴ عبرت سے مشاہدہ کیا تھا۔ انہوں نے بتایا اور سب سے بڑھ کر الجزائر کے وزیر تعلیم نے بالکل غیر ڈپلومیسی انداز میں اس کی تصدیق کی کہ تاشقند اور بخارا کی مسجدوں میں بڑھوں ہی بڑھوں کا ایک انبوه ہوتا ہے۔ نوجوان ایک دو صرف وہ ہوتے ہیں جنہیں روس کی حکومت باہر سے آنے والے مہمانوں کے ساتھ کر دیتی ہے یا یوں کہئے کہ پیچھے لگا دیتی ہے۔ یہ بڑھے مسلمان زائرین کو دیکھ کر زار و قطار روتے ہیں اور ایک لفظ نہیں بولتے۔ جب

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

امام اور ترجمان سے پوچھا گیا کہ یہ کیوں رو رہے ہیں تو جواب ملا کہ 'یہ خوشی کے آنسو ہیں۔' دکتور بصر سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے جھنجھلا کر کہا: یہ خوشی سے نہیں رو رہے ہیں۔ اپنی بے بسی پر خاموش ماتم کر رہے ہیں۔ الجزائر کے وزیر تعلیم نے حکومت روس سے باقاعدہ احتجاج کیا کہ انہیں آزادی کے ساتھ ملنے جلنے اور بات کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ خیر اگر اسلام کے رشتہ سے کچھ بولنا رجعت پسندی ہے تو کیا چیکو سلواکیہ اور ہنگری کو محض اس لئے بھلایا جاسکتا ہے کہ وہاں لڑائی نے طول نہیں پکڑا اور ایک بھرپور وار میں کام تمام ہو گیا؟ آخر بنگلہ دیش کے سلسلہ میں روس کے کردار پر لب کشائی کا وقت کب آئے گا؟ کیا اس بات کا انتظار ہے کہ مغربی پاکستان بھی قومیتوں (نیشنلسٹ) میں بٹ جائے تب دل کی بھڑاس نکالی جائے؟ الجزائر کے اجتماع میں تو روس کو صاف صاف مورد الزام قرار دیا گیا۔ استاد محمد عبداللہ عنان کا ذکر پہلے آچکا ہے استاد علل فاسی نے بھی تکلف برطرف دن کو دن اور رات کو رات کہا۔ ہماری ڈپلومیسی کا شاہکار ابھی سب کو یاد ہو گا کہ جب روس اور ہندوستان کا معاہدہ ہوا تو وزارت خارجہ نے اعلان کیا کہ ہمارے نمائندے نے روسی لیڈروں سے بات چیت کی ہے اور ہم مطمئن ہیں کہ اس معاہدہ سے پاکستان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ رموز مملکت خوش خرواں واند۔

ہاں تو رباط تیو ملیلین نے ایک محترم مقام پیدا کر لیا یہاں تک کہ مغرب کی آزاد حکومت نے اسے مالی امداد سے نوازا۔ ممتاز اہل وطن اور حکومت کے مشیر اس کے جلسوں میں شرکت کو باعث عزت تصور کرنے لگے۔ استاد علل فاسی کو بھی باصرار دعوت نامے آئے لیکن انہوں نے برابر انکار کیا۔ کچھ عرصہ بعد امریکہ سے ایک صاحب وارد ہوئے انہوں نے 'رباط تیو ملیلین' کو اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع بنایا تھا۔ جب وہ علل فاسی سے ملے اور ان کی رائے دریافت کی تو علل فاسی لکھتے ہیں کہ مجھے غصہ آگیا اور میں نے کہا: ہمارے ہاں دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی (جامعۃ القروین۔ فاس) موجود ہے اسے چھوڑ کر آپ نے تیو ملیلین کو اپنی توجہ کا مرکز اور بحث کا موضوع بنایا ہے۔ یہ علم کے پردے میں اسلام دشمنی نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کے بعد حکومت مغرب کی بھی آنکھی کھلیں اور اس نے سخت اقدام کر کے تیو ملیلین کو بند کر دیا اور سرزمین مغرب سے اس کا وجود ختم کر دیا۔

استاد علل فاسی لکھتے ہیں کہ ایک تیو ملیلین بند ہو گیا تو کیا؟ اور بہت سے ادارے مختلف روپ دھارے اب بھی کام کر رہے ہیں مجھے یاد آیا کہ ہمارے پاکستان میں اسی قسم کا ادارہ کانگریس فار کلچرل فریڈم (Congress for Cultural Freedom) قائم تھی۔ یونیورسٹیوں کے سربراہ اور اساتذہ اس سے وابستہ تھے۔ اس کے مالی وسائل کی بابت شک کرنے کے وجوہ موجود تھے۔ لیکن کوئی بولے تو سننے والا کوئی نہیں اور بولنے والے کا منہ بند کرنے کے ہزار طریقے۔ بالآخر امریکہ سے تصدیق ہوئی کہ وہ سی۔ آئی۔ اے۔ کا ذیلی ادارہ تھا تب اس کا کاروبار بند ہوا جو اس ادارے میں ملوث تھے وہ آج بھی مکرم و محترم ہیں اور بدستور دوسروں کو اسلام اور حب وطن کا درس دیتے ہیں۔ ورلڈ یونیورسٹی سروس کی بابت جب شک و شبہ کا اظہار کیا گیا تو اسلام اور نظریہ پاکستان کے محافظوں نے اسے بری کر دیا اور بیرون ملک اس کی مجلسوں میں شرکت کو اپنے لئے جائز کر لیا۔

بحث کے دوران ان پر سب کا اتفاق تھا کہ موجودہ وقت میں اسکول ہسپتال اور ثقافتی اور معاشرتی بہبود کے ادارے جو مشنریوں نے اسلامی ممالک میں قائم کر رکھے ہیں۔ اسلام دشمنی کا سب سے مؤثر حربہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ حکومتیں ایسی سرگرمیوں کو ممنوع قرار دینے میں حق بجانب ہوں گی اور اگر وہ ایسا نہیں کرتیں تو اپنے فرض میں کوتاہی کرتی ہیں لیکن یہ محض منفی رویہ ہو گا جو پست ہمتی کی دلیل ہے۔ ضرورت ایجابی عمل ہے اور وہ یہ کہ ہم خود مشنری اداروں کی فکر کے تعلیمی طبی اور ثقافتی ادارے قائم کریں۔ استعمار کے دور میں یہ ادارے دنیوی مناصب اور مال و جاہ تک چڑھنے کا زینہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

تھے۔ اگر یہ صورت حال اب بھی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ غلامانہ ذہنیت باقی ہے۔ کم از کم اتنا ضرور ہے کہ مسلم ممالک کو اب خطرے کا احساس ہو گیا ہے (اس خطرے کا احساس غیر مسلم ممالک کو بھی ہے جیسے برما اور سیلون جنہوں نے مشنری اسکولوں کو قومی تحویل میں لے لیا ہے اور فورڈ فاؤنڈیشن، ایشیا فاؤنڈیشن جیسے اداروں کو بھی ملک بدر کر دیا ہے) بعض مسلم ممالک نے مشنری اداروں پر پابندیاں عائد کی ہیں۔ میں نے اس ضمن میں بتایا کہ حکومت پاکستان نے مشنری اسکولوں کو پابند کیا ہے کہ وہ اسلامیات کی تعلیم کا اہتمام کریں۔ یہ سب کچھ خوش آئند تو ہے لیکن اس مرض کا علاج نہیں۔ اصل مرض وہ ہے جس کی نشاندہی استاد علال فاسی نے کی وہ لکھتے ہیں کہ یورپ کی استعماری طاقتوں نے، بالخصوص انگریزوں اور فرانسیسیوں نے مسلم ممالک میں جو نام تعلیم رائج کیا تھا، وہ بدستور آج تک رائج ہے۔ اس میں کوئی بنیادی تبدیلی کہیں بھی نہیں ہوئی۔ اس نظام تعلیم کی بدولت دین تو بالکل ہی ہاتھ سے گیا۔ دنیا بھی حاصل نہ ہوئی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں مسلمانوں کا آج بھی کوئی مقام نہیں جب کہ ایشیا کی دوسری قومیں جاپان اور چین دیکھتے ہی دیکھتے کہیں سے کہیں پہنچ گئیں۔ اسلام علوم برابر کس میرسی کی حالت میں ہیں۔ نظام تعلیم کی تشکیل نو کے سلسلہ میں ارباب حکومت اسلامی علوم کو مرکزیت اور ان کے شایان شان اہمیت دینے کو تیار نہیں، قدیم اور جدید کے امتزاج کی جو کوششیں کی جاتی ہیں ان کی زد اسلامی علوم پر پڑتی ہے۔ برائے نام اسلام کو نصاب تعلیم میں شامل کرنا اسلامی علوم کو فنا کرنے کا آسان طریقہ ہے اور اس سے وہ مقصد پورا ہوتا ہے جس میں شارل دو فو کو (اور میکالے) ناکام رہے انہوں نے اسلامی علوم کو نصاب سے خارج کر کے انہیں فنا کرنا چاہا لیکن وہ سرکاری اسکولوں سے باہر زندہ و باقی رہے۔ اب جو کوششیں جاری ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ قدیم و جدید کے امتزاج کے نام پر اسلامی مدارس کا وجود بے معنی ہو جائے اور اسلامی علوم نہ یہاں کے نہ وہاں کے، کہیں کے بھی نہ رہیں۔ اسلامی علوم کی تجدید کے نام پر جو کچھ کیا جاتا ہے اس سے بھی اسلام کی صورت مسخ ہوتی ہے۔ یہ تشریر کے وہ مقاصد ہیں جو ہم خود اپنے ہاتھوں پورا کرتے ہیں۔

دکتور وصفی ابو مغلی نے اس نقطہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ سرکاری مدارس میں طلبہ کو قرآن کی آیات اور احادیث رٹادی جاتی ہیں اور قرآن وحدیث کے علم سے محروم رہتے ہیں۔ یہ حال عرب ممالک کا ہے۔ دوسروں کے سامنے کہتے شرم آتی ہے لیکن انہوں کو تو معلوم ہونا چاہئے کہ ایوب کے دور میں جن ماہرین تعلیم کو بلا استحقاق اسلامی ریسرچ اور اسلامی تعلیم کا پر مٹ دیا گیا تھا انہوں نے عربی سے معری ایسی اسلامیات ایجاد کی اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کی کہ ایم۔ اے کے درجہ میں بھی قرآن کی آیات اور احادیث نہیں بلکہ ان کا اردو ترجمہ رٹایا جاتا ہے۔ اگر سزا و جزا حق ہے تو اسلامی علوم کو رسوا کرنے اور اسلام کو بازیچہ اطفال بنانے کا یہ جرم ناقابل معافی ہے۔

اس بحث کے ضمن میں استاد عثمان الکعاک نے ایک بڑی دلچسپ اور مفید بات بتائی جو قابل ذکر ہے۔ مسلمان سوڈیٹھ سو برس سے مغربی نظام تعلیم اپنائے ہوئے ہیں۔ سائنس کی تعلیم پر خاص توجہ ہے، اور بے حد و حساب خرچ ہو رہا ہے، پھر بھی مسلمانوں کا سب سے بڑا سائنسدان وہ ہے جو مغرب کا ادنیٰ شاگرد ہو۔ سونے پر سہاگہ بعض نام نہاد علماء کے ایسے فتوے ہیں جن سے دشمنان اسلام کو یہ کہنے کا موقع ملتا ہے کہ اسلام سائنس سے ڈرتا ہے اور اور بھاگتا ہے۔ استاد عثمان الکعاک نے کہا کہ جب عباس بن فرناس نے ۸۷۳ء میں پہلی گھڑی ایجاد کی تو اس کی غایت اس کے سو اچھے نہ تھی کہ نماز کے اوقات معلوم کرنے میں آسانی ہو۔ چنانچہ جب اس نے گھڑی قرطبہ کے اموی خلیفہ محمد بن عبد الرحمن کی خدمت میں پیش کی تو اس پر یہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

دو شعر بھی لکھے تھے۔

الا اننی للدين خير اداة اذا غاب عنكم وقت كل صلاة

ولم تر شمساً بالنهار ولم تنر كواكب ليل حالك الظلمات

”گھڑی سانِ حال سے کہتی ہے، دیکھو میں دین کے کام بہترین آلہ ہوں۔ جب تمہیں نماز کے وقت کا پتہ نہ چلے، نہ تو دن کو سورج دکھائی دے اور نہ اندھیری سیاہ رات میں ستارے روشن ہوں۔“ یہ وہی عباس ہی فرانس ہے جو پہلی مرتبہ پرندوں کی نقل کرتا ہوا ہوا میں اڑا اور جس نے مصنوعی بلور (کرٹل) ایجاد کیا۔

الجزائر کے وزیرِ تعلیم کا کہنا تھا کہ عباس فرانس کے یہاں جو روح کار فرما تھی اسی کو برقرار رکھتے ہوئے علم الفلک اور فلکیات کے جدید آلات کو دین کے کام کے آلات سمجھنا چاہئے اور اگر مطلع ابر آلود ہو یا کسی وجہ سے چاند دیکھنا ممکن نہ ہو اور حساب کی رو سے افق پر چاند موجود ہو تو اسے تعلیم کر لینا چاہئے اور آنکھ سے چاند دیکھنا ممکن نہ ہو اور حساب کی رو سے افق پر چاند موجود ہو تو اسے تسلیم کر لینا چاہئے اور آنکھ سے چاند دیکھنے پر اصرار نہ ہونا چاہئے۔ کچھ عرصہ قبل کویت میں مسلم وزراء اوقاف کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس میں بھی فیصلہ کیا گیا کہ چاند کی گردش کے حساب کو ماہرینِ فلکیات پر چھوڑ دیا جائے اور وہ علمی وثوق کے ساتھ جو تقویم (کیلنڈر) تیار کریں اس پر عمل کیا جائے۔ کوئی تعجب نہ ہو گا اگر مستقبلِ قریب میں یہ فیصلہ نافذ ہو جائے مجھے اپنے بچپن کی بات یاد ہے کہ بھوپال میں نواب حمید اللہ خان عید گاہ میں لاؤڈ سپیکر نصب کرانا چاہتے تھے اور قاضی شہر کی یہ کوشش تھی کہ کسی طرح یہ بلا ٹل جائے۔ آج یہ حال ہے کہ آئے دن لاؤڈ سپیکر پر جو بدعتیں منائی جاتی ہیں ان سے پورے محلے کے طالب علموں کے مطالعہ میں اور مریضوں کے آرام میں خلل پڑتا ہے۔

اس بحث کے دوسرے روز الجزائر کے عربی روزنامہ نے ایک لطیفہ لکھا۔ بعد میں تصدیق ہوئی، کہ دراصل وہ ایک واقعہ ہے جو شاہ فیصلہ کو پیش آیا۔ چند بد و قبائلی شیخ اپنی کید لک کاروں میں بیٹھ کر شاہ فیصلہ کے محل پہنچے۔ اندر پہنچے تو شاہ فیصلہ ایک ٹیلی ویژن پر وگرام دیکھ رہے تھے۔ شیخ خالص بدوی انداز میں معترض ہوئے اور بولے، صحابہؓ کے عہد میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ شاہ فیصلہ نے نہایت خاموشی سے اپنے ملازمین کو بلایا اور ان سے کچھ بات کی۔ شیخ برہم تو تھے ہی۔ تھوڑی دیر بعد جانے کے لئے محل سے باہر نکلے اور الٹے پیروں اندر واپس آئے۔ مزید برہمی کے لہجے میں شاہ فیصلہ سے بولے۔ ہماری کاریں غائب ہیں، کہاں چلی گئیں؟ شاہ فیصلہ نے کہا، صحابہؓ کے عہد میں کاریں نہیں ہوتی تھیں۔ کاروں کی جگہ چند اونٹ کھڑے ہیں ان پر سوار ہو کر آپ جہاں سے آئے ہیں وہاں تشریف لے جائیں۔

اجتماع کے دوران اس پر مستقل بحث ہوئی کہ انسان چاہے تو ریڈیو ٹیلی ویژن کے ذریعہ خیر کو فروغ دے اور چاہے تو گھر گھر فساد پھیلانے۔ یہ انسان کا اپنا فعل ہے اور وہ اس کے لئے ویسا ہی جواب دہ ہے جیسا کہ اپنے ہاتھ، پیر، کان، آنکھ اور زبان کے افعال کے لئے۔

ایک اور موضوع جس پر خوب بحث ہوئی اور خاصا اختلاف رائے بھی رونما ہوا وہ تھا ’مسلم اقلیتیں‘ خاص طور پر گفتگو کا محور یہ تھا کہ مسلم اقلیتوں کو جو غیر مسلم اکثریت سے گھری ہوئی ہیں۔ کس قسم کے خطرات لاحق ہیں اور اس سلسلہ میں مسلم حکومتوں پر کیا فرض عائد ہوتا ہے اور وہ کس طرح

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اس سے عہدہ برآ ہو سکتی ہیں تاکہ مسلم اقلیتوں کا اخلاقی ثقافتی اور اجتماعی تشخص برقرار رہے اور ان کی عزت و وقار میں بھی فرق نہ آئے۔

استاد محمد عبداللہ عنان نے اپنے مقالہ میں صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ کچھ مسلم اقلیتیں تو وہ ہیں جو ”ہجرت اختیار“ یعنی اپنے اختیار اور مرضی سے ترکِ وطن کے نتیجے میں وجود میں آئی ہیں۔ آج کینیڈا، امریکہ، برازیل، ارجنٹائن، انگلینڈ، فرانس، اٹلی اور بہت سے دوسرے ملکوں میں وہ مسلمان آباد ہیں جو تلاشِ روزگار، اقتصادی خوشحالی اور علمی ترقی کی خاطر اپنا وطن چھوڑ کر گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مسلمان غیر اسلامی اکثریت کے ماحول میں زندگی گزارتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان کو بڑی حد تک شہری آزادیاں اور بنیادی حقوق حاصل ہوئے ہیں، لیکن اس سے بھی یہ انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بسا اوقات یہ مختلف قسم کے تعصبات کا شکار ہوتے ہیں اور ایسے مواقع آتے ہیں، جب ان کی عزت و وقار کو ٹھیس لگتی ہے۔ ان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اپنی مخصوص دینی، ثقافتی اور اجتماعی زندگی کی ضروریات سے محروم ہوتے ہیں۔ چند بڑے شہروں کو چھوڑ کر نہ تو ان کے لئے مساجد ہوتی ہیں اور نہ مقبرے جہاں اسلامی طریقہ کے مطابق دفن کا انتظام ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مقامی عورتوں سے شادی بیاہ کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ مقامی زبان سے گھر کے باہر تو واسطہ پڑتا ہی ہے۔ گر کے اندر بھی استعمال ہونے لگتی ہے اور مقامی نظامِ تعلیم اور ماحول اسلامی ثقافت اور اسلامی اقدار سے بالکل ہی بیگاہ ہوتا ہے نتیجہ یہ کہ جیسے جیسے وقت گزرتا ہے یہ مسلمان مقامی معاشرہ میں ضم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ یورپین باشندے جو اسلامی ممالک میں رہتے ہیں ان کی اپنی عبادت گاہیں، مقبرے اسکول اور کلب ہوتے ہیں اور وہ ہر طرح اپنی روحانی اور ثقافتی ضروریات کا احساس کرتے ہیں۔ اس تقابل سے مسلم حکومتوں کا فرضِ آسانی پہچانا جاسکتا ہے۔ ہمارے یہاں بھی ایسے سرکاری اور نیم سرکاری ادارے ہونا چاہئیں جن کو حکومت کی سرپرستی اور امداد حاصل ہو اور جو دینی اور قومی خدمت کے جذبہ سے بیرون ملک رہنے والے بھائیوں کی نگہداشت کریں۔

دوسری طرف وہ مسلم اقلیتیں ہیں جو تاریخی عوامل کے نتیجے میں وجود میں آئیں اور جو اپنے ہی وطن میں اقلیت کی حیثیت سے رہتی ہیں۔ اکثر جگہ دیکھا جائے تو تعداد کے لحاظ سے یہ خاصی بڑی ہیں۔ انہیں اقلیت محض اضافی طور پر کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یوگوسلاویا، بلغاریا، یونان، حبشہ اور فلپین کے مسلمان ہیں ان کی اپنی مساجد اور مدارس ہیں اور یہ بڑی حد تک اسلامی طریقہ زندگی پر قائم ہیں اور خود اپنے اندر قائم رہنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اس کے باوجود غیر مسلم اکثریت کی حکومتیں وقتاً فوقتاً انہیں تفریقِ عنصری اور سیاسی ظلم کا نشانہ بناتی رہتی ہیں۔ جو مسلم اقلیتیں علمی و اقتصادی لحاظ سے آگے بڑھی ہوئی ہیں وہ کچھ نہ کچھ اپنا دفاع کر لیتی ہیں اور بیرونی دنیا کو اپنی آواز سنا دیتی ہیں۔ اس صورت میں بھی مسلم حکومتوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ مسلم اقلیتوں کے حقوق کی حمایت میں جتنا بھی ممکن ہو اپنا اثر و نفوذ استعمال کرنے میں دریغ نہ کریں۔

ان مسلم اقلیتوں کا مسئلہ بے شک مایوس کن ہے جو تعداد میں بہت کم ہیں مثلاً قبرص میں ۸۰ ہزار، روڈس میں ۱۵ ہزار، رومانیہ میں ۲۰ ہزار، پولینڈ میں ۵ ہزار مسلمان ہیں۔ قبرص کے مسلمانوں کو حکومتِ ترکی کی حمایت حاصل ہے اور ان کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو غیر مسلم اکثریت میں ضم نہیں ہونے دیں گے لیکن اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اگر مسلم حکومتوں نے کوئی متحدہ کوشش کی تو باقی اور جو اقلیتیں ہیں وہ ایک نہ ایک روز غیر مسلم اکثریت میں گھل مل جائیں گی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

استاد محمد عبد اللہ عنان کو اندلس کی تاریخ سے خاص شغف ہے اور اس موضوع پر ان کی کئی اعلیٰ تصانیف ہیں۔ انہوں نے اندلس کی تاریخ سے مثال دیتے ہوئے کہ جب اندلس کے عیسائیوں نے یکے بعد دیگرے مسلمانوں کی ریاستوں اور ان کے علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کیا تو ان علاقوں کے بہت سے مسلمان عیسائی حکومتوں کے تابع بن کر وہیں کے وہیں رہ گئے۔ انہیں تاریخ میں ’مدجنون‘ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ ’مدجنون‘ رفتہ رفتہ عیسائیوں میں ضم ہو گئے محض اس لئے کہ مسلم حکومتیں ان سے بے تعلق ہو گئیں۔ انہیں انکے حال پر چھوڑ دیا یا یوں کہے کہ خدا کے حوالہ کر دیا، ان کے لئے کچھ نہ کیا یہاں تک کہ دعاؤں میں بھی بھلا دیا۔

اس وقت دو علاقے ایسے ہیں جہاں کھلم کھلا مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کی کوشش اور منظم کوشش جاری ہے ایک تو حبشہ اور اریٹریا میں تقریباً پچاس برس سے مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں۔ حالانکہ ان کی تعداد تین چار ملین ہے پہلے ذکر آچکا ہے کہ مسلم حکومتیں، حتیٰ کہ قریب کی عرب حکومتیں اس بارے میں سکوت مصلحت آمیز کارویہ اختیار کیے ہوئے ہیں بلکہ شہنشاہ ہینا سلاسی کی آؤ بھگت کرتی ہیں۔ دوسری طرف فلپین میں مسلمانوں کا خون بہہ رہا ہے اور ظلم و تشدد کے ایسے واقعات ہو رہے ہیں جنہیں سن کر رو گئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سال گزشتہ (۲۰۱۷ء) کے اسی اجتماع میں فلپین کے نمائندے نے اس کی تفصیلات بلا جھجک بیان کی تھیں۔ اسی فلپین میں بدھ اور دین نا آشنا قبائل بھی آباد ہیں لیکن عیسائیوں کے حملہ کا نشانہ صرف مسلمان ہیں۔ فلپین کے بارے میں مسلم حکومتوں کا شعور کچھ بیدار ہوا ہے لیکن مؤثر عمل کی منزل ہنوز دور ہے۔

اندلس ہی کی تاریخ سے ایک اور مثال دیتے ہوئے استاد محمد عبد اللہ عنان نے کہا کہ پندرہویں صدی سے لے کر سترہویں صدی عیسوی تک کا زمانہ وہ ہے جب اندلس میں عیسائی ایک ایک کر کے مسلمانوں کا صفایا کر رہے تھے۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس زمانہ میں عالمی سطح پر مسلمان اپنی طاقت کھو چکے تھے اور بے بس تھے نہیں! اس کے برعکس اسی زمانہ میں دولت عثمانیہ ایک زبردست طاقت بن کر ابھر چکی تھی اور محمد الفاتح جنوبی اٹلی کی بندرگاہوں پر کامیاب حملہ کر چکے تھے۔ اندلس کے مسلمانوں نے دولت عثمانیہ سے مدد کی درخواست بھی کی لیکن وہاں کے حکمران مشرقی یورپ اور مصر فتح کرنے میں لگے رہے اور انہوں نے اندلس کے مسلمانوں کی فریاد نہ سنی حالانکہ وہ طاقت جو دینا تک روندنی چلی گئی اور جس نے بحیرہ روم میں اپنی بالادستی ثابت کر دی تھی اس کے لئے اندلس کے حکمرانوں سے حساب چکانا کوئی مشکل نہ تھا۔

اس وقت بھی گو مسلم ممالک پس ماندہ ہیں اور ان کی فوجی طاقت عالمی سطح پر قابل ذکر نہیں تاہم اگر وہ مسلم اقلیتوں کی حمایت اپنا فرض سمجھیں اور متحد ہو کر ممکنہ تدابیر اختیار کریں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

اسی موضوع پر دوسرا مقالہ دکتور محمد عبد الرحمن بیصار کا تھا جو مجموعہ البحوث الاسلامیہ (اسلامی ریسرچ کونسل) مصر کے سیکرٹری جنرل ہیں اور عرصہ تک اسلامک سنٹر واشنگٹن کے ڈائریکٹر رہ چکے ہیں۔ انہیں پورا پورا اتفاق تھا کہ مسلم اقلیتوں کے حالات تشویشناک ہیں اور ان کی مدد کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ لیکن مدد کس سطح پر کی جائے اور کن طریقوں سے کی جائے۔ اس بارے میں ان کی رائے بالکل مختلف تھی۔ ان کی رائے میں حکومتوں کے دخل دینے سے معاملات سلجھنے کے بجائے اور زیادہ سنگین بن جاتے ہیں۔ انہوں نے بڑی حد تک یہ ثابت کیا کہ بین الاقوامی سیاست کی بساط پر مہرہ بازی ایسی شاطرانہ ہے۔ چالیں ایسی الجھی ہوئی ہیں اور پینترے اتنی تیزی سے اڈتے بدلتے ہیں کہ اگر مسلم اقلیتوں کی حمایت کا بوجھ ڈالا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

جائے تو بہت سی کمزوریاں سامنے آتی ہیں۔ عجب عجب تضاد ابھرتے ہیں اور بجائے اس کے کہ مسلم اقلیتوں کو فائدہ پہنچے اُلے اپنی رسوائی ہوتی ہے۔ دکتور بیسار کا پختہ خیال تھا کہ غیر سرکاری ادارے ہونا چاہئے جو علمی ثقافتی اور سماجی میدان میں مسلم اقلیتوں کی مدد کریں اور ان میں عزت اور تنہائی کا شعور کم کریں۔ مسلم حکومتیں دوستانہ طریقہ پر دوسری حکومتوں سے مسلم اقلیتوں کے حق میں جتنا کہہ سکیں اسی پر اکتفاء کریں۔

مجھے اس موضوع پر تعقیب (اظہار رائے) کا موقع ملا، میں نے کہا کہ استاد محمد عبداللہ عثمان نے یورپ افریقہ اور مشرق بعید کی مسلم اقلیتوں کا ذکر کیا اور بجا طور پر کیا لیکن وہ ہندوستان اور وسط ایشیا کی نہایت اہم مسلم اقلیتوں کو بھول گئے۔ یقیناً انہوں نے عمداً ایسا نہیں کیا۔ اس سے قطع نظر مجھے ان کی رائے سے پورا پورا اتفاق ہے کہ اقلیتوں کی حمایت کا کام بنیادی طور پر حکومتوں کا ہے۔ مسلم عوام اور غیر سرکاری ادارے حکومتوں کی مدد کر سکتے ہیں، حکومتوں سے تعاون کر سکتے اور حکومتوں پر دباؤ بھی ڈال سکتے ہیں۔ لیکن بالآخر یہ کام حکومتوں ہی کو انجام دینا ہے۔ ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے اور آج بھی یہی ہو رہا ہے کہ حکومتوں کی دلچسپی کے بغیر اقلیتوں کی حمایت کا مسئلہ محض علمی اور جذباتی مسئلہ بنا رہتا ہے جب حکومت کوئی اقدام کرتی ہے۔ خواہ وہ محض قول اور زبانی احتجاج تک محدود ہو۔ تب ہی کچھ اثر کی توقع ہوتی ہے۔ جس طرح بھلی بری حکومت کے بغیر ایک معاشرہ کا تصور ناممکن ہے۔ اسی طرح بین الاقوامی میدان میں بعض کام ایسے ہیں جو حکومت کے توسط کے بغیر نہیں ہو سکتے۔ یہ صحیح ہے کہ بڑی طاقتوں کی طرف جھکاؤ کے بارے میں مختلف مسلم ممالک مختلف خارجہ پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ لیکن اگر حق انصاف اور اسلامی اخوت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے تھوڑی سی جرأت اور قربانی کا جذبہ نہ ہو تو بات کرنا ہی فضول ہے۔ مختلف اوقات میں پاکستانی حکومتوں کا جھکاؤ امریکہ کی طرف رہا ہے لیکن اس کی وجہ سے انہوں نے فلسطین میں عربوں کے حقوق کی حمایت کرنے میں آنا کافی نہیں کی۔ بحث کے دوران اقوام متحدہ کا بھی ذکر آیا تھا۔ میں نے کہا کوئی مسلم ملک ایسا خوش قسمت نہیں جسے اقوام متحدہ سے کچھ بھی ہاتھ لگا ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اقوام متحدہ نے حق و ناحق بڑی طاقتوں کی چوہدراہٹ اور بالادستی قائم رکھنے کے سوا کوئی مسئلہ حل نہیں کیا۔ پاکستان کا تازہ تلخ تجربہ یہ ہے کہ وہ ادارہ جو قوموں کی سالمیت اور آزادی اور بین الاقوامی امن کی نگرانی کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اسی ادارہ کا ایک رکن، ایک بڑی طاقت کی مدد اور پشت پناہی میں، ایک دوسرے رکن پر جارحانہ حملہ کر کے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ تھوڑے دن بعد اس ادارے کے ارکان یکے بعد دیگرے اس جارحانہ حملہ کی حقیقت کو حقیقت بنگلہ دیش نہیں، بلکہ پاکستان پر جارحانہ حملہ ہے) خود اپنے ہی منشور کی عصمت وری کو دھڑا دھڑا تسلیم کر لیتے ہیں۔

ایں دم تحریر یہ اضافہ کر لیجئے کہ جب اٹلی نے ابی سینا پر حملہ کیا تو اقبال کی دور رس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ لیگ آف نیشنز کا قابو تیار ہے مستقبل کا مورخ بتائے گا کہ پاکستان پر حملہ یونائیٹڈ نیشنز کے مرض الموت کی علامت ہے یا نہیں۔ اس میں تو شک نہیں کہ اسے بھی جلد یا بدیر موت آنی ہے۔

آخر میں میں نے کہا کہ ایک ٹھوس مثال لیجئے: ہندوستان کی مسلم اقلیت ایک باعزت اور باشعور اقلیت ہے۔ اس نے ذمے درمے سنبھالنے ہمیشہ اپنی اسلامی حمیت کا ثبوت دیا ہے۔ اس نے محض اپنے ذرائع و وسائل پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی تعلیمی اور ملّی ضروریات کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قائم کی، جس کی آغوش میں تربیت پانے کا مجھے بھی فخر حاصل ہے۔ اس یونیورسٹی میں نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کی بلکہ افریقہ اور ایشیاء کے دور

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

دراز حصوں میں بسنے والے مسلمانوں کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ہندو طلبہ پر بھی اس کے دروازے برابر کھلے رہے ہیں۔ آج ہندوستان کی حکومت جبر و تشدد کے ذریعہ اس عظیم یونیورسٹی سے اس کی اسلامیت چھیننے یا یوں کہئے کہ اس کی روح سلب کرنے پر مُضمر ہے۔ کوئی بتائے کہ غیر سرکاری طریقوں سے اس اسلامی ورثہ کو کیونکر تباہی سے بچایا جاسکتا ہے؟ آپ ایک عربی و اسلامیات کا پروفیسر بھیج دیں۔ کتابیں تحفہ میں دے دیں، مالی امداد کر دیں۔ اس سے صورت حال میں کیا فرق پڑتا ہے۔ ہاں! اگر مسلم حکومتیں یک زبان ہو کر احتجاج کریں تو کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہو گا۔ بات لشکر کشی یا انتقامی کارروائی کی نہیں۔ صرف ذرا سی اخلاقی جرأت کی بات ہے۔

میں اپنے نقطہ نظر کی حمایت میں شاید بہت آگے بڑھ گیا، بحث علمی تھی، لیکن سیاست کے حوالہ سے ہو رہی تھی۔ سخن گسترانہ پاکستان کا نام بھی آگیا۔ دکتور بیصار کی جوابی تقریر کا رخ بیشتر میری طرف تھا۔ انہوں نے بڑی شدت سے اپنی رائے کا اعادہ کیا اور سیاست کی گندگی بلکہ حماقت اور جہالت کو کھول کر رکھ دیا۔ ان کا یہ کہنا صحیح تھا کہ جہاں اسلام کا واسطہ ہو وہاں سیاست میں سب امام ہوتے ہیں اور مقتدی کوئی نہیں۔ اس لئے کسی بھی منظم عمل کی توقع عبث ثابت ہوتی ہے حکومتوں کا حال اس لئے برا ہے کہ ارباب حکومت بسا اوقات علم سے محروم ہوتے ہیں اور اہل علم کو دور رکھتے ہیں۔ اس ذیل میں انہوں نے اپنا تجربہ بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ جس زمانہ میں، میں اسلامک سنٹر واشنگٹن کا ڈائریکٹر تھا تو میرا سابقہ تمام اسلامی ملکوں کے سفیروں سے رہتا تھا جو سب کے سب سترہ اٹھارہ بلحاظ عہدہ سنٹر کی مجلس ادارت (گورننگ باڈی) کے ممبر تھے ان میں شاذ و نادر ہی کوئی علم کی بات کرتا تھا سب کے سب سفارت کی آن بان کے ساتھ بولتے تھے اور اپنا اپنا راگ الاپتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے عید کی نماز پڑھائی تو اتفاق سے سورۃ الطارق کی یہ آیت تلاوت کی **یوم تبلی السرائر فمالہ من قوۃ ولا ناصر** آخری لفظ 'ناصر' ایک اسلامی ملک کے سفیر سمجھ پائے اور وہ ان کی سیاست کو ایسا کھٹکا کہ نماز کے بعد احتجاجاً بولے (انگریزی میں) ڈاکٹر بیصار! آپ نماز میں 'ناصر' کا پرچار کر رہے تھے۔ علم و دانش کے اس شاہکار پر سارا ہال قہقہہ سے گونج اٹھا۔ قہقہہ میں بھی شریک تھا لیکن میری نظریں نیچی تھیں۔ میرے لئے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ اس لئے کہ ڈاکٹر بیصار نے کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی تھی اور پاکستان کا نام بھی لے دیا تھا۔ الغرض یہ قہقہہ اس سنجیدہ اور گرم گرم بحث کا مقطع بن گیا اور سب ہلکے پھلکے ہنستے ہوئے مجلس سے باہر نکلے۔

اس پر مجھے یاد آرہا ہے کہ دکتورہ بنت الشاطی مصر کی نامور ادیبہ اور یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ چند سال ہوئے وہ ہندوستان گئی تھیں۔ واپسی پر انہوں نے قاہرہ کے روزنامہ الاہرام میں ایک مضمون لکھا۔ انہوں نے لکھا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی جب میں ہندوستان میں ایسے لوگوں سے ملی جو عربی زبان سے نابلد ہیں اور ان میں سے کسی نے قرآن کا ترجمہ کر ڈالا ہے اور کسی نے تفسیر لکھ ڈالی ہے دکتورہ بنت الشاطی نے مسلم حکومتوں سے اپیل کی تھی کہ جس طرح وہ قرآن کو غلط طباعت سے محفوظ رکھنے کا اہتمام کرتی ہے اسی طرح قرآن کو نااہلوں کے ترجمہ و تفسیر سے محفوظ رکھنے کا بھی اہتمام کریں۔ یہ بات اس وقت کی ہے جب نہ مولانا کوثر نیازی وزیر تھے اور نہ ہماری حکومت کو اس طرف توجہ تھی۔ آج اگر یہ بات کان میں پڑ جائے تو شاید دل کو لگ جائے۔ کم از کم اتنا تو ہو کہ جو ادارے حکومت کی نگرانی میں ہیں ان میں کوئی شخص عربی زبان کا باقاعدہ علم حاصل کئے بغیر قرآن پر لب کشائی اور خامہ فرمائی نہ کرے۔ علمی دیانت اور دین کے تقدس دونوں کا یہی تقاضا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

مسلم اقلیتوں کے ذیل میں ان الجزائری باشندوں کا مسئلہ ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے جو اس صدی میں طلبِ رزق کے لئے جا کر فرانس میں آباد ہو گئے ہیں۔ فرانس میں الجزائری باشندوں کی فلاح و بہبود کو الجزائری حکومت اپنی بہت بڑی ذمہ داری سمجھتی ہے۔ اس موضوع پر ایک خصوصی مقالہ دکتور العربی زبیری نے پڑھا۔ دکتور زبیری یورپ میں الجزائری باشندوں کے امور مذہبی کے نگران ہیں۔ نوجوان اعلیٰ تعلیم یافتہ حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار، تواضع اور علم کا احترام ان کی نمایاں صفت۔ یہ بات ’سول سروس کی جنت‘ کے علاوہ اور کہیں دیکھنے میں نہیں آئے گی کہ علماء کا یونیورسٹی کے پروفیسروں کا اجتماع ہو اور ایک معمولی بی۔ اے۔ ایم۔ اے۔ پاس سول ملازم کرسی صدارت کی طرف بڑھے۔ تفویر تو اسے چرخ گرداں تفوی! الغرض دکتور زبیری اختصاصی معلومات رکھتے تھے جو انہوں نے اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے دوران بطور خود مستعدی اور خلوص سے جمع کی تھیں ان کا مقالہ بہت مفید تھا اور یہ ایک ہی مقالہ تھا جس کی بابت مناقشہ کی گنجائش نہیں پائی گئی۔

دکتور زبیری لکھتے ہیں: اس وقت بیس میں سے ایک الجزائری ملک کے باہر روزی کماتا ہے۔ اس کا تاریخی پس منظر ہے۔ فرانس نے الجزائری قبضہ کرنے کے بعد یہاں کی اقتصادیات تمام تر فرانسیسی آباد کاروں کے تصرف میں دے دیں۔ تمام اچھی زمینوں کا انہیں کومالک بنادیا۔ اہل وطن محرومی اور بیکاری کا شکار ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں فوج میں جبری بھرتی کا قانون نافذ ہوا۔ جب الجزائری فوجی خدمت کے سلسلے میں یورپ گئے تو انہوں نے وہاں کی معیشت کو وطن کی معیشت سے بدرجہا بہتر پایا۔ وہاں کی ترقی یافتہ صنعت و حرفت کو ان کے زور بازو کی ضرورت تھی۔ یہ وہیں رہ پڑے۔ ان کی دیکھا دیکھی ترک وطن کا سلسلہ شروع ہو گیا جو آج تک جاری ہے۔ ایسا بھی ہوا کہ تعلیم یافتہ حساس نوجوانوں نے دیکھا کہ جن شہری حقوق اور بنیادی آزادیوں کا فرانس کے مقبوضہ الجزائری میں خون ہو رہا ہے وہ حقوق اور آزادیاں انہیں فرانس میں نصیب ہو سکتی ہیں۔ اس لئے انہوں نے فرانس میں سکونت کو ترجیح دی۔ پورے یورپ میں جو باہر کے مزدور کام کر رہے ہیں ان کا دسواں حصہ الجزائری ہیں۔

۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۶۲ء تک فرانس میں رہنے والے الجزائری ایک فرانسیسی شہری کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے حقوق و فرائض وہی تھے جو فرانس کے اہل وطن کے تھے۔

الجزائر کی آزادی کے بعد سے سارے الجزائری فرانس میں اجنبی اور پردیسی بن گئے۔ اب ان کو صرف وہ حقوق ملیں گے جو دونوں حکومتوں کی باہمی رضامندی سے طے پا جائیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ اب ان کے خلاف بہت سے تعصبات اور عداوتیں کارفرما ہیں۔

یہ امید بے جا نہیں کہ جب الجزائری کے اقتصادی حالات بہتر ہو جائیں گے تو ترک وطن کا محرک باقی نہیں رہے گا لیکن اس وقت تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا جاسکتا۔ اس وقت یورپ میں الجزائری کے ساٹھ ہزار خاندان آباد ہیں ان میں بیس سال سے کم عمر کے ڈھائی لاکھ سے زیادہ نوجوان لڑکے لڑکیاں ہیں۔ ان کو جو خطرے درپیش ہیں وہ یہ ہیں۔

1. اجتماعی اور سماجی خطرے: یہ تارکین وطن تنہائی اور ماحول سے عدم مطابقت کے نتیجے میں طرح طرح کے امراض کا شکار ہوتے ہیں۔ ان میں جنسی امراض اور سینہ کے امراض خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ گھر سے تربیت پا کر جب الجزائری فرانس جاتا ہے تو وہ کھانے پینے کی ان تمام چیزوں سے پرہیز کرتا ہے جو اسلام میں حرام ہیں۔ حلال چیزیں اسے ملتی نہیں اور اگر ملتی ہیں تو اس کی قوت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

خرید سے باہر ہوتی ہیں۔ اب کچھ ایسی جماعتیں کام کرتی دکھائی دیتی ہیں جو بیچہ کی اور بعض دوسری کھانے پینے کی سہولتیں فراہم کرتی ہیں۔ ان کو بسا اوقات حکومت کی سرپرستی اور امداد بھی حاصل ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے عمل کی نوعیت کچھ مشکوک ہو جاتی ہے۔ بہر حال یہ اجتماعی اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرنے کی بجائے اسلام کے نام پر مسلمانوں کو بے وقوف زیادہ بناتی ہیں اور اپنا اُلوسیدھا کرتی ہیں وہ بات اپنی جگہ پر ہے کہ مسلمانوں کو اس قسم کی غذا میسر نہیں آتی جو اس کی صحت کے لئے ضروری ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ صحت کے تقاضوں کے مطابق رہنے کو مکان نہیں ہوتا۔ چھوٹی جگہ میں بہت سے آدمی رہتے ہیں جہاں گرم رکھنے کا انتظام نہیں ہوتا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ سانس لینا بھی دشوار ہوتا ہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک پلنگ پر باری باری کئی آدمی سوتے ہیں جس سے متعدی امراض پھیلتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو زکام ہو جائے تو وہ ایک دن آرام نہیں کرتا۔ برابر کام پر جاتا ہے کہ اجرت کا نقصان نہ ہو یہاں تک کہ مرض بڑھ کر خطرناک شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی سردی سے بچنے کے لئے کپڑوں کا اہتمام نہیں کرتے حالانکہ یہ مقامی مزدوروں کی طرح شراب بھی نہیں پیتے جس سے کچھ بدن کی حرارت کا سامان ہو۔ سخت اور جان لیوا کام جس سے مقامی مزدور گریز کرتے ہیں وہ یہ بخوشی قبول کر لیتے ہیں اور اپنی طاقت سے زیادہ اور مقررہ اوقات سے زیادہ کام کرتے ہیں جس کے نتائج تباہ کن ہوتے ہیں۔ فیکٹریوں اور کارخانوں میں حادثات سے دوچار ہوتے ہیں اس لئے کہ مشینوں کے استعمال سے متعلق لکھی ہوئی تعلیمات پڑھ نہیں سکتے۔ اعداد و شمار سے پتہ لگتا ہے کہ عورتیں خاص طور پر عقلی امراض میں مبتلا ہو جاتی ہیں اس لئے کہ وہ ایک قیدی کی طرح پڑی رہتی ہیں اور تنہا زندگی کی صعوبتیں جھیلی ہیں۔

یہ حال تو اس نسل کا ہے جو وطن سے تربیت پا کر باہر جاتی ہے۔ یہ اپنے وطن سے عزیز رشتہ داروں سے گہرا جذباتی تعلق رکھتے ہیں۔ مخصوص دینی اور اجتماعی روایات کے عادی ہوتے ہیں اور باوجود ان شوریوں کے جو اوپر بیان ہوئیں، ان پر قائم رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہوتا کہ نئے معاشرہ میں میل جول بڑھائیں اور ان سے متاثر ہوں۔ لیکن ان کے بچوں کا حال ان سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ یہ بچے پردیس میں آنکھیں کھولتے ہیں۔ ان کے باپ سارا سارا دن گھر سے باہر رہتے ہیں۔ مائیں بالکل جاہل اور غیر تربیت یافتہ ہوتی ہیں۔ ان میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ بچوں کی نگرانی کر سکیں۔ یہ بچے سارا سارا دن اسکول میں اور محلہ میں مقامی بچوں کے ساتھ کھیلتے رہتے ہیں۔ یہ بے تکلفانہ دوستوں کے گھر جاتے ہیں۔ اور فطری طور پر ان کے رہن سہن کا اپنے رہن سہن سے مقابلہ کرتے ہیں۔ انہیں اپنے دوستوں کے والدین کی عقلیت ذہنیت بھی روشن اور برتر نظر آتی ہے۔ مجموعی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں احساس کمتری پیدا ہوتا ہے اور یہ اپنے معاشرہ کی ہر چیز سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ جب یہ کیفیت پوری طرح ابھر کر سامنے آتی ہے تو ماں باپ کو سخت صدمہ ہوتا ہے لیکن وہ اپنے آپ کو عاجز اور بے بس پاتے ہیں۔

وطن سے کٹ جانے کا ایک سبب یہ ہے کہ دوری کے باعث آمدورفت دشوار ہے۔ وطن کی بہ نسبت ایک تارک وطن پردیس میں اچھا خاصا کماتا ہے لیکن اتنی ہی وہاں گرانی بھی ہوتی ہے۔ وطن جانے کے لے ایک تو سفر کے مصارف، دوسرے اعزہ و احباب کے لئے تحفہ تحائف خریدنے کا بندوبست کرنا پڑتا ہے۔ چھ سات سال میں بمشکل اتنا جوڑ پاتا ہے کہ اہل و عیال کے ساتھ تھوڑے دن کے لئے وطن جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ بچے وطن اور اہل وطن کو اپنا سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ایک طرف توپر دیں کاماحول احساس کمتری پیدا کرتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ سارے وسائل ابلاغ یہ تاثر دیت ہیں کہ الجزائر پس ماندہ ملک ہے۔ وہاں کے لوگ وحشی اور جاہل ہیں۔ بالخصوص عورت کی وہاں معاشرہ میں کوئی قدر و قیمت نہیں۔

اس طرح یورپ کے بعض خطرناک رجحانات قبول کرنے کے لے زمین تیار ہو جاتی ہے۔ آج یورپ میں آرام آسائش اور لذت اندوزی کے تمام مادی وسائل بقدر وافر میسر ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ روحانی قدریں معدوم ہیں اور اخلاقی شعور مردہ ہو چکا ہے نوجوان ایک اندرونی کرب و بے چینی سے نجات پانے کے لئے طرح طرح کے نشے کرتے ہیں اور بے ہودہ اور ناشائستہ حرکات کی نمائش کرتے ہیں۔ تارکین وطن کے بچے بھی ان کی تقلید کرنے لگتے ہیں اور جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ الجزائر کے معاشرہ میں یہ سب معیوب اور لائق تفریر ہے تو وہ اس معاشرہ سے باغی ہو جاتے ہیں۔

نوجوانوں کی یہ انانیت اور خود رائی جو بے راہ روی اور بے قید و بند لذت اندوزی کے سوا کچھ نہیں گھر اور خاندان کو پاش پاش کر دیتی ہے۔ ایسے بھی واقعات ہوئے ہیں کہ جب ایک الجزائر لڑکی نے اپنے بوائے فرینڈ کو باپ کے سامنے پیش کیا تو اس نے خود کشی کر لی۔ کبھی کبھی جب باپ نے سختی کی تو لڑکی نے حکومت سے شکایت کر دی اور حکومت نے لڑکی کو آزاد قرار دیتے ہوئے اس کی حمایت کی۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور اس کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ لڑکوں کا فرانسسی لڑکیوں کا ہو رہنا تو معمولی بات ہے۔ بہت سے لڑکے تو اپنا نام تک بدل دیتے ہیں۔ ہشام ک بجائے میٹال اور یوسف کے بجائے جوزف۔

پردیس میں پلنے بڑھنے والے نوجوانوں کے ذہن دین کے صحیح تصور اور اس کی تعلیمات سے بالکل خالی ہوتے ہیں۔ گھروں میں اسلام کا جو نمونہ ان کے سامنے ہوتا ہے وہ جہل خرافات اور اوہام کی وجہ سے ان کے لئے نفرت انگیز ہوتا ہے۔ ایسے میں ان پر ایک طرف تو مسیحی مبلغ حملہ کرتے ہیں اور دوسری طرف بائیں بازو کی جماعتیں ترقی پسندی کے نام پر ان کو باسانی اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ فرانس میں مسیحیت کے بعد دوسرا نمبر دین اسلام کا ہے اس لئے مسیحی مبلغ خاص طور پر اسلام کے پھیلاؤ کو روکنے میں سرگرم ہیں۔ مادی خدمات سے لہجنا اور مادی منافع کا لالچ دینا ان کا جانا پہچانا حربہ ہے۔ دن کو جب مرد گھروں سے غائب ہوتے ہیں وہ دھڑلے سے عورتوں اور بچوں کو اپنی مہربانیوں کا نشانہ بناتے ہیں۔ بائیں بازو کی جماعتوں کے بعض اصول خوشنما اور جاذب توجہ ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ وہ قوم اور جنس کی بنا انسان انسان میں تفریق کی مخالفت کرتی ہیں لیکن جب کوئی ان کے قریب چلا جائے تو یہ سبق سیکھے بغیر نہیں رہتا کہ دین مذہب ایک ایون ہے۔ یہ تاثر بھی عام ہے کہ اسلام جاگیر داری، سرمایہ داری کا دین ہے۔

ایک جماعت وہ بھی ہے جو اپنے آپ کو 'حزب الفرسین' کہتی ہے۔ یہ جماعت دین کے نام پر الجزائر کی مزدوروں کی ہمدردی حاصل کرتی ہے اور ان کو الجزائر کی حکومت کے خلاف اکساتی ہے اور یہ سبز باغ دکھاتی ہے کہ منظم ہو کر وہ فرانس میں اپنا مقام پیدا کریں۔ یہ جماعت پیرس کی مسجد سے اپنی سرگرمیوں کی ابتدا کرتی ہے اور اس کے پیچھے ایسی قوتیں کار فرما ہیں جو منظر عام پر نہیں آتیں۔

کچھ یارانِ طریقت ایسے بھی ہیں جنہوں نے بھانپ لیا ہے کہ پردیس میں رہنے والے تارکانِ وطن جہل کے باوجود دین سے عقیدت رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ پھیری والوں کی طرح گشت کرتے ہیں۔ تعویذ گنڈے نیچتے ہیں، خوب کھاتے پیتے ہیں اور منہ مانگا معاوضہ لے کر وعظ کرتے ہیں، میلاد پڑھتے اور قرآن سناتے ہیں۔ وہ لوگ جو قرآن بھی نہیں وہ ان شعبہ بازوں کے کرتب کو باعث برکت سمجھتے ہیں اسلام بدنام ہوتا ہے اور نوجوانوں کی نفرت

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

بڑھتی ہے۔

دکتور زبیری کی رائے میں سب سے بڑی ضرورت یہی ہے کہ درویشوں اور شعبہ بازوں کا راستہ روکا جائے اور گھر کے اندر اور گھر کے باہر اسلام کی پاک، صاف، سادہ، اصل شکل پیش کی جائے جس میں ایسی حرکیت (Iynamism) ہو کہ اس کے سامنے نہ تو تعویذ گنڈے اور ادھام و خرافات ٹھہر سکیں اور نہ جاگیر داری اور معاشی ظلم باقی رہ سکے۔

دوسری اہم ضرورت یہ ہے کہ تارکین وطن کی نئی نسل کو عربی زبان اور دین کی تعلیم کا انتظام کیا جائے، لیکن یہ انتظام اسی اعلیٰ معیار کا ہونا چاہئے جو فرانس کے مدارس کا معمول ہے۔ اس کا بچے کے ذہن پر بہت برا اثر پڑتا ہے کہ وہ عربی اور دین کی تعلیم کسی پست معیار کے مدرسہ میں پست معیار کے مدرس سے حاصل کرے۔

تیسری اہم ضرورت یہ ہے کہ ایسی تعلیم یافتہ مخلص خواتین کی ایک جماعت تیار کی جائے جو تارکین وطن کی جاہل عورتوں کو زندگی کے طور طریقے سکھائیں اور انہیں اولاد کی تربیت کا اہل بنائیں۔ بعض تارکین وطن اپنے بال بچوں کو الجزائر میں ہی چھوڑ کر جاتے ہیں۔ یہ بچے بھی آوارگی اور بے راہ روی اختیار کر لیتے ہیں۔ ماؤں سے نگرانی نہیں ہوتی اور باپ پر دیس سے جو رقم بھیجتے ہیں وہ عام معیار سے کچھ زیادہ ہوتی ہے اس لئے نوجوانوں کو رنگ رلیوں کی سوچھتی ہے۔ اس لئے خود الجزائر میں بھی سماجی کارکن خواتین کے لئے وسیع میدان ہے ایسے خاندانوں کی حالت جن کا اوپر ذکر ہوا وہی درست کر سکتی ہے۔

دکتور زبیری نے کہا۔ میں بہت سے ایسے نوجوانوں سے ذاتی طور سے ملا ہوں جو اسلام سے بیزار ہیں۔ امید افزا بات یہ ہے کہ وہ معقول گفتگو کے لئے تیار ہیں۔ انہوں نے صفائی کے ساتھ بتایا کہ وہ اسلام کی بابت کچھ نہیں جانتے۔ انہیں صرف اتنا معلوم ہے کہ اسلام جاگیر داری نام سے وابستہ ہے۔ اسلام میں مرد و عورت کے درمیان عدم مساوات ہے۔ ادھام خرافات اور درویشوں کی شعبہ بازی وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اگر اسلامی معاشرہ کی کوئی بہتر شکل ہو تو انہیں نفرت اور بیزاری کی کوئی وجہ نہیں۔

دکتور زبیری نے یہ بھی کہا کہ پورے عالم اسلام کے نمائندوں کے سامنے میں مخصوص طور پر الجزائر کے تارکین وطن کے احوال پیش کر رہا ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ بہت سے دوسرے اسلامی ممالک کے تارکین وطن یورپ میں بالکل ہی حالات سے دوچار ہیں۔ اس لئے یہ موضوع عالم دلچسپی کا ہے اور سب کے لئے اہمیت رکھتا ہے۔

دکتور زبیری نے بالکل سچ کہا۔ ان کی تقریر کے آئینہ میں اگر ہم پاکستانی اپنی شکل دیکھیں تو بہت سے داغ دھبے نظر آجائیں۔ انگلیڈ میں لاکھوں پاکستانی باشندے رہتے ہیں۔ الجزائر کی حکومت کا احساس ذمہ داری آپ نے دیکھا۔ عملی طور سے انہوں نے بھی شاید کوئی بڑا قدم نہیں اٹھایا لیکن احساس ذمہ داری تو ہے کیا ہماری سفارت کے کسی رکن کو یہ توفیق ہوئی کہ وہ اتنی سمجھ خلوص اور ہمدردی سے انگلیڈ میں بسنے والے پاکستانیوں کے احوال کا جائزہ لے؟ بہتوں سے وہاں کے پاکستانیوں کے لطیفے سننے کا اتفاق ضرور ہوتا ہے اور ہاں! ہمارے لیڈر جو طرح طرح کے پلان بنانے کے لئے علاج کے بہانے لندن جاتے رہتے ہیں۔ انہوں نے کبھی اس طرف توجہ کی؟ ہماری حکومت کو اس سے دلچسپی ہے، کہ پاکستانی وہاں سے زر مبادلہ کما کر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

سہجے رہیں۔ یہ دلچسپی بے جا نہیں، لیکن ان پاکستانیوں کو جہل سے نجات دلانا، غیر ملک میں ان کا وقار بڑھانا، ان کی اسلامی ثقافت اور پاکستانی تہذیب کو برقرار رکھنا کس کی ذمہ داری ہے؟ عالمانِ شریعت و رتبہ الانبیاء ہیں۔ خدا انہیں رشد و ہدایت کی جرأت و ہمت دے لیکن یہ پیرانِ طریقت جو جہل کا خراج وصول کرتے پھرتے ہیں انہیں کب تک چھوٹ ملی رہے گی؟ سوشلسٹ حکومت سے ایک توقع یہ تھی جو خاک ہو گئی۔ خود اپنے گھر کا حال یہ ہے کہ مزاروں پر ادھام خرافات اور بدعتوں کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ ہتھ رو کے ہوائی اڈے کو موچی دروازہ بنادینا آسان ہے لیکن اپنے ضابطہ حیات سے اپنے علم اور پاکیزگی اخلاق سے دوسری قوموں کو متاثر کرنا عقل شعور تنظیم اور ان تھک محنت کا کام ہے۔

الجزائر میں علماء کے اجتماع کی رونماد ختم ہوئی، تعلیم یافتہ اور مفکر طبقہ نے توجہ سے پڑھا اور مجھ سے چند سوالات بھی کیے۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ انہیں خاص طور پر اسلامی فقہ و قانون سے دل چسپی پیدا ہوئی۔ اگر تھوڑا سا اس کا تاریخی پس منظر بیان کر دیا جائے تو امید ہے کہ الجزائر کے اجتماع میں جو نکات زیر بحث آئے ان کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔ صد افسوس کہ ہمارے یہاں ایک طبقہ نے جو عربی و اسلامی علوم سے بے بہرہ اور اسلام سے خود غرضانہ اور ریاکارانہ دلچسپی رکھتا ہے۔ اس طبقہ نے اسلام کو ایک آئیڈیالوجی بنا ڈالا ہے جس کا اردو ترجمہ ’نظریہ حیات‘ کیا جاتا ہے جو زشتہ چودہ صدی کے اسلامی لٹریچر میں کہیں استعمال نہیں ہوا۔ یہ طبقہ چونکہ حکومت میں دخیل ہے دنیاوی جاہ کا مالک، ڈکٹیٹروں کے ظلم و استبداد میں اپنا حصہ لگاتا ہے اور جب جمہوریت کی ہوا چلے تو عوام کے جمہوری حقوق پر بھی تقریریں جھاڑ دیتا ہے۔ اس لئے نظریہ حیات کی اصطلاح ایسی چل پڑی ہے کہ علماء کی زبان پر بھی چڑھ گئی ہے جو اسلامی جماعتیں ووٹ کی دیوانی ہیں وہ اس کی حفاظت کے لئے میدان میں اتر آئی ہیں اور اس کے نام پر سرمایہ داروں، زمینداروں سے لاکھوں روپے چندہ جمع کر چکی ہیں۔ حد یہ ہے کہ اسلامی نظریہ حیات ہماری یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے جو علمی دیوالیہ پن کی کھلی دلیل ہے۔ اسلامی نظریہ حیات کو ایک منضبط علم (Academic Discipline) کا درجہ دینا ایسی ڈھٹائی ہے جس کی مثال دنیا میں مشکل سے ملے گی۔ الغرض یہ طبقہ جس نے اسلام کو نظریہ حیات بنا ڈالا ہے یہ اسلامی قانون و شریعت کو دلوں سے بھلا دینے کا مجرم ہے دوسری طرف ایک طبقہ وہ ہے جسے حکومت اور تمام دنیاوی کاروبار سے ایسا بے دخل کیا گیا ہے کہ وہ عملی طور سے اسلامی شریعت کے نفاذ سے مایوس ہو چکا ہے۔ اس لئے اس نے اسلام کو عبادات میں محصور کر دیا ہے اور اپنے دائرہ نفوذ کو توسیع دینے کے لئے طرح طرح کی غیر اسلامی رسمیں اور بدعتیں ایجاد کرتا رہتا ہے۔ اس سب کے ساتھ یہ ایک پیش پا افتادہ حقیقت ہے جس کا اعتراف مشکل ہی سے کیا جاتا ہے کہ انگریزوں نے دو چیزیں ایسی چھوڑی ہیں جن سے چھٹکارا پانا آزادی کے دور میں بھی آج تک کسی اسلامی ملک کو نصیب نہیں ہوا۔ ایک تو ہے نام تعلیم اور دوسرے قانون۔ جس طرح حج میں لوگ (الا ماشاء اللہ) شیان پر کنکریاں پھینک کر آتی ہیں اور ویسے کے ویسے رہتے ہیں اسی طرح ہمارے ماہرین تعلیم انگریزی نظام تعلیم کی کیا کیا برائیاں نہیں کرتے لیکن بنیادی اصلاح اور پست کر دیتے ہیں۔ اصلاح کے لئے جس وسعت علم، ثقافت اور انقلابی فکر اور جرأت کی ضرورت ہے وہ ہمارے یہاں مفقود ہے۔

اس تمہید سے مقصد یہ ہے کہ اسلام اگر شریعت و قانون نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اب ذرا تاریخ کا مختصر جائزہ لیجئے۔ جب اسلام آیا تو اس نے سب سے پہلے جزیرہ عرب میں اپنا قانون نافذ کیا۔ جب فتوحات کا سلسلہ چلا تو بہت سے ایسے ممالک قبضہ میں آئے جہاں رومانی اور ایرانی قانون چلتا تھا۔ ہر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

جگہ مسلمانوں نے اپنی شریعت اور اپنا قانون نافذ کیا۔ یہ بتاتا چلوں کہ جہاں تک حکومت کے نظم و نسق (Administration) کا تعلق ہے مسلمانوں نے رومیوں اور ایرانیوں سے بہت کچھ لیا اور سیکھا۔ ضرورت ظاہر ہے۔ عرب منظم مرکزی حکومت سے نا آشنا تھے۔ اور ان کے پاس مرکزی حکومت کے ادارے (Institutions) نہ تھے لیکن حضرت عمرؓ کا ’دیوان‘ قائم کرنا یا عبد الملک کا سکہ اور برید کے نام کو فروغ دینا اور بات ہے۔ قانون بالخصوص معاملات اور تعزیرات کا قانون اور بات ہے۔ فن تعمیر میں فلسفہ اور سائنس میں عربوں نے سب ہی کچھ دوسری قوموں سے لیا اور بلا جھجک بغیر کسی احساس کمتری کے پورے اعتراف اور شرم کیہ کے ساتھ لیا۔ اور جو کچھ لیا اسے بڑے سلیقہ سے برتا مگر قانون کے دائرہ میں کسی دوسری قوم سے کچھ لینا اسلام کے وجود کی نفی کرنے کے مترادف ہے۔ چنانچہ بنو امیہ کا دور ہو یا بنو عباس کا۔ قانون وہی شریعت کا رہا۔ یہ صحیح ہے کہ کسی دور میں خلوص کے ساتھ اسے نافذ کیا گیا اور کسی دور میں اس پر عمل کرانے میں چشم پوشی کی گئی لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ شریعت کو کسی اجنبی قانون سے بدلا گیا ہو۔ مسلمان اپنی بد اعمالیوں کے نتیجہ میں یہودیوں سے قرض لیتے اور انہیں سود دیتے رہے لیکن کسی کو ”ربوا“ حلال کرنے کی نہ سوچھی۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ جب مسلمان عروج پر تھے تو دوسری قومیں تہذیب اور معیشت کے اعتبار سے اتنی پست تھیں کہ فیشن کے طور پر کسی کی نقالی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صلیبی جنگوں میں جب یورپ سے نیم وحشی جماعتیں شام پہنچیں تو انہوں نے پہلی دفعہ ایک مہذب اور متمدن معاشرہ دیکھا۔ اس ترقی یافتہ معیشت اور معاشرہ کی کونسی ضرورت ایسی تھی جو اسلامی قانون سے پوری نہ ہوتی ہو؟ بنو عباس کے دور میں مسلمانوں نے یونانیوں کے سارے علمی خزانے کھول ڈالے۔ ارسطو کو ”معلم“ کے لقب سے نوازا۔ لیکن دو چیزیں ایسی تھیں جنہیں اپنے استفادہ کے لائق نہ سمجھا۔ پہلی چیز یونانی ادب۔ ارسطو نے خطابت اور شعر پر جو لکھا ہے وہ عربی میں منتقل ہوا۔ عربی ترجمہ آج تک موجود ہے لیکن ترجمہ کے ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کہ ارسطو نے جو معیار قائم کئے ہیں وہ عربی شعر و ادب کی مخصوص فطرت سے میل نہیں کھاتے۔ لہذا وہ سب قابل توجہ قرار پائے۔ صرف خطابت کے چند اصول جو عام انسانی فطرت کے ملاحظہ پر مبنی ہیں ادب کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ آج اردو کے ناقدوں کا یہ حال ہے کہ انگریزی سے چور کرتے ہیں اور چوری نہیں کرتے تو اسی پر تکیہ کرتے ہیں۔ بسا اوقات ان کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ جب تک انگریزی اصل ذہن میں نہ ہو۔ اگر مغربی معیار کی ٹوپی ہمارے شعر و ادب کے سر پر ٹھیک نہ بیٹھے تو سر کا حجم اور شکل بدل دیتے ہیں۔ اور اس کو ہیئت کے نئے تجربہ کا نام دیتے ہیں۔ بھانڈ بھی جو کچھ کرتا ہے وہ ہیئت کے نئے تجربہ سے مختلف تو نہیں ہوتا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ نئے تجربے ضرور کیجئے لیکن اپنی ہیئت تو منحن نہ کیجئے۔ موجودہ دور میں بھی ادب اور شاعر اپنی کانفرنسوں میں باقاعدہ قرارداد کے ذریعہ یہ فیصلہ دے چکے ہیں کہ مثلاً آزاد نظم معرّی اور بے قافیہ نظم ہماری زبان کے مزاج اور فطرت کے خلاف ہیں۔ چنانچہ عربی میں اس بے راہ روی کا سد باب ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود جدید عربی شاعری جدت سے بھرپور ہے۔ الغرض عربوں نے یونانی ادب کی طرف ایک نظر دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ رہی دوسری چیز یعنی قانون تو اس کی طرف تو دیکھا ہی نہیں۔

عباسی دور ختم ہوا تو عثمانی دور شروع ہوا۔ اس میں بھی وہی اسلامی قانون رائج رہا۔ شیخ الاسلام محض نکاح طلاق کے فتوے دینے کے لئے تو نہ تھا۔ پوری سلطنت کے نام قضاء کو شریعت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا اس کی ذمہ داری تھی۔ جب نئی تدوین کی ضرورت پیش آئی تو وہی اسلامی قانون تھا جسے ”مجلہ“ کی شکل میں ڈھالا گیا۔ اس میں کسی غیر مسلم کی رائے شامل نہ تھی۔ نہ کسی غیر اسلامی قانون سے کچھ اخذ کیا گیا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

کہ عالمی تجارت اور صنعت و حرفت سے جو نئے مسائل پیدا ہوئے تھے ان کے شرعی احکام بھی اس میں شامل تھے۔ الغرض اٹھارویں صدی عیسوی تک ساری دنیا میں جہاں کہیں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ وہاں قانون کا سرچشمہ اسلامی شریعت ہی تھی۔ ہندوستان میں جب اسلامی شریعت کے بعض تقاضوں کو سیاسی مصلحت پر قربان کیا گیا تو عالمگیر نے شریعت کا احیاء کیا۔ ترکش مارا خدنگ آفریں۔ فتاویٰ عالمگیری آج بھی قابل قدر کارنامہ ہے۔

اس کا ذکر آچکا ہے کہ کوڈنپولین اسلامی فقہ سے ماخوذ ہے۔ کیا اسلامی فقہ کی برتری کا یہ اعتراف کافی نہیں؟ پھر آج کیوں ہم یہ سمجھنے لگے ہیں کہ انگریزی قانون کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا؟ اچھا تو یوں دیکھئے کہ کسی قانون کے اچھا یا برا ہونے کا معیار کیا ہے؟ اچھا قانون وہ ہے جو معاشرے کو جرائم سے پاک رکھے۔ مجرم قرار واقعی اور عبرت آموز سزا سے نہ بچنے پائے۔ انصاف بلا رحمت بلا معاوضہ اور بلا تاخیر ہو کسی کا حق ضائع نہ ہو اور کسی کو باطل کی حمایت کی جرأت نہ ہو۔ بڑے سے بڑا مغرب زدہ بھی یہ دعوے کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ انگریزی قانون اس معیار پر پورا اترتا ہے۔ سینٹ جال فلپی کی کتابیں پڑھیے۔ اس نے یہ نظارہ دیکھا ہے کہ نجد کے قبضوں میں بڑے سے بڑے مقدمے کا فیصلہ آدھ گھنٹہ میں ہو جاتا ہے اور جس کے خلاف فیصلہ ہوتا ہے وہ بھی مطمئن جاتا ہے کہ انصاف ہوا۔ فریقین از خود اپنا اپنا ثبوت اور اپنے اپنے گواہ لے کر قاضی کے پاس جاتے ہیں۔ قاضی دونوں کی سنتا ہے۔ اپنا فیصلہ دیتا ہے اور دونوں کو سمجھا دیتا ہے کہ اس کا فیصلہ حق ہے۔ مثال کے طور پر آپ کو یاد ہو گا کہ کراچی جیل کے سامنے عین دوپہر کے وقت ایک لڑکی بالجبر اغوا کی جاتی ہے۔ تقریباً سو آدمی اس جرم کے شاہد عینی ہیں۔ اگر اس واقعہ کے ایک گھنٹے کے اندر قاضی موقع پر پہنچ کر شہادت سن لیتا تو وہیں کے وہیں فیصلہ سنایا جاسکتا تھا اور ملزم کے پکڑے جانے کے بعد فوراً ہی اسی جگہ جیل کے سامنے اسے ایسی عبرت ناک سزا دی جاسکتی تھی کہ آئندہ برسوں تک اغواء کا کوئی واقعہ نہ ہوتا۔ اس کے برعکس انگریزی قانون کے تحت کیا ہوا؟ برسوں مقدمہ چلا اور نتیجہ ناگفتی اور ہاں! ایسے دلاور مجرم کو بھی اپنے دفاع کے لئے وکیل میسر آیا۔ یہ وکالت کا پیشہ اور کیلوں کی بے ضمیری جو انگریزی قانون کا جزو لا ینفک ہے۔ اس کی عزت تو اب مسلم ہو چکی ہے۔ اپنے بچپن کی بات مجھے یاد آتی ہے۔ لوگ فتوے پوچھتے پھرتے تھے کہ وکالت کی آمدنی جائز ہے یا ناجائز؟ ایسے لوگ بھی میری نظر میں ہیں جنہوں نے ساری عمر وکالت کی۔ لیکن وکالت کی کمائی سے حج کرنا پسند نہیں کیا۔ باپ کی چھوڑی ہوئی جائیداد بیچ کر یا بیوی کا میکہ سے لایا ہوا زیور بیچ کر حج کیا۔ یہ بات پاکستان کی نہیں جو اسلام کے نام پر قائم ہو بلکہ اس ہندوستان کی ہے جو انگریز غلام تھا۔ اب تو مدت ہو گئی، کسی عالم سے کسی موقع پر وکالت کے پیشہ کی بابت ایک لفظ نہیں سنا۔ اور لیجئے انگریزی قانون اتنی مدت سے نافذ ہے اور چوری کے جرائم کی تعداد برابر بڑھتی جاتی ہے جہاں چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے وہاں یہ حال ہے کہ مدینہ کے والی نے مجھے بتایا کہ تین چار سال میں کوئی ایک چھوٹا موٹا واقعہ سامنے آتا ہے۔ بہر حال یہ سمجھنا غلط ہے کہ جس کثرت سے روز چوری کے مقدمات ہوتے ہیں اسی کثرت سے روزانہ ہاتھ کاٹے جایا کریں گے۔ اگر ایک ہاتھ کٹنے سے کئی برس تک معاشرہ کو امن و سکون مل جائے تو کونسا مہنگا سودا ہے؟ اس میں کونسی وحشت اور بربریت ہے۔ نیویارک کی سڑکوں پر مغرب کے بعد ٹکنا خطرناک ہو تو تہذیب و تمدن کا عروج ہے اور مکہ میں دوکان کھلی چھوڑ کر آپ اطمینان سے گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے کہیں چلے جائیں تو رجعت پسندی اور بربریت ہے!!! ”مختسب“ کا لفظ کچھ ایسا غزل کے نذر ہوا ہے کہ ہم اپنے نظام احتساب کو بھول گئے ہیں۔ یہ نظام سارے عالم اسلام میں رائج تھا۔ البتہ اندلس کی تاریخوں میں اس کی تفصیلات ملتی ہیں۔ ناپ تول میں کمی، ملاوٹ، نفع خوری اور گلی کوچوں میں بد اخلاقیوں کا یہ واحد موثر علاج ہے۔ اگر ایک قاضی مجسٹریٹ کے درجہ کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع اور منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

محترم اور باوقار ہستی پیادہ بازاروں میں گشت کرے، خود جانچ پڑتال کرے۔ عوام کی شکایات سنے اور وہی کے وہیں موقع پر قرار واقعی سزا دے تو ان سماجی برائیوں کے خاتمہ میں کتنی دیر لگتی ہے۔ آپ نے یہ غور نہیں کیا کہ اگر محتسب اپنی کچہری میں بیٹھا رہتا اور مقدمات کی پیشی کا انتظار کرتا، تاریخ پر تاریخ بڑھتی و کیلوں کو جرح و بحث کا موقع ملتا تو پھر میخواریوں کو محتسب کا اتنا ڈر کیوں ہوتا؟ اور سنئے! مجھے ابھی تک نہیں معلوم کہ میری طالب علمی کے زمانے میں طالب علموں کے قانونی حقوق کیا تھے؟ البتہ اتنا یاد ہے کہ کبھی میرے یا میرے والد کے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ استاد کے خلاف مقدمہ بھی دائر کیا جاسکتا ہے۔ آج استاد اگر طالب علم تو سزا دے تو FIR تیار کرتا ہے۔ ثبوت کار پکار ڈبنا ہوتا ہے اور یہ یاد رکھتا ہے کہ اگر طالب علم کا باپ پیسہ والا ہو تو وہ کوئی بڑا وکیل لے کر عدالت پہنچے گا اور بڑا وکیل وہ ہے کہ چاہے معاشرہ کو کچھ نقصان پہنچے، اس کا موکل کامیاب ہو جائے۔ ویسے عدالت کے باہر معاشرتی اصلاح پر وہ بڑی اچھی تقریر بھی کر سکتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ استاد ٹک ٹک دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں بولتے جب اس صورت حال سے استاد کے علاوہ کسی دوسرے کو تکلیف پہنچتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ استادوں نے اپنا وقار اور اثر کھو دیا ہے۔

یہ چند مثالیں ہیں اس بات کی کہ انگریزی قانون جراثیم کی انسداد میں ناکام ہے۔ اس کے تحت سماجی برائیوں کا یہ حال ہے کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ اس کے برخلاف اسلامی قانون کا جہاں اور جس حد تک تجربہ کیا گیا ہے۔ کامیاب رہا ہے۔

اسلامی قانون کوئی جامد چیز نہیں ہے۔ سوسائٹی کی ضروریات کے ساتھ اس میں بڑھنے کی فطری صلاحیت رکھی گئی ہے۔ ترکی مجملہ کے بعد سے اس کی بڑھت کی ہوئی ہے۔ آج ضرورت ہے کہ اس کی دوبارہ تدوین کی جائے اور اسے شریعت کے بتائے ہوئے اجتہاد کے طریقوں سے موجودہ زمانہ کی ضروریات کا کفیل بنایا جائے لیکن یہ محض بہانہ سازی ہے کہ پہلے کوئی نیک بندہ شرعی قوانین کا مجموعہ تیار کرے پھر اس پر غور کیا جائے۔ درخت اسی وقت بڑھتا ہے جب اس کی جڑیں زمین میں ہوتی ہیں۔ اسی طرح قانون اسی وقت بڑھتا ہے۔ جب اس پر عمل ہو۔ پھر بھی علماء اس فرض سے غافل نہیں۔ مالی وسائل کی کمی بے شک ان کی راہ میں حائل رہتی ہے۔ ایک منصوبہ حکومت کویت کی اعانت سے شروع کیا گیا تھا اور دوسرے منصوبہ پر دمشق میں کام ہو رہا تھا۔ دکتور مصطفی الزرقاء سے الجزائر کے اجتماع میں یہ معلوم کر کے بڑا ہی قلق ہوا کہ مالی امداد بند ہو جانے کے سبب یہ دونوں منصوبے ختم ہو گئے۔ ابھی چند دن ہوئے اخبار سے معلوم ہوا کہ سعودی عرب کی حکومت نیا منصوبہ بنا رہی ہے۔ خدا کرے یہ منصوبہ کامیاب ہو۔ (بشکریہ ”جنگ“ کراچی)